ISSN 0974-7346

نومبر ۲۰۲۲ء

جلد ۲۰۹—عدد ۱۱

مجلس دارالمصنّفین کا ماہوار علمی رسالہ

دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ

DARUL MUSANNEFIN SHIBLI ACADEMY, AZAMGARH

سالانہ زر تعاون

ہندوستان	سالانہ ۳۵۰ روپے۔ فی شمارہ ۳۰ روپے۔ رجسٹرڈ ڈاک ۵۵۴ روپے۔ ۵ سال کی خریداری صرف ۱۵۰۰ روپئے میں دستیاب۔ لائف ممبر شپ ۱۰۰۰۰ روپے ہے۔
دیگر ممالک	رجسٹرڈ ہوائی ڈاک ۲۹۴۰ روپے۔ ہندوستان اور پاکستان کے درمیان ڈاک کا سلسلہ بند ہے۔ اس لئے فی الحال پاکستان معارف کی ترسیل موقوف ہے۔
بذریعہ ایمیل	اشتراک پی ڈی ایف بذریعہ ایمیل (ساری دنیا میں) ۳۵۰ روپے سالانہ۔

سالانہ چندہ کی رقم بینک ٹرانسفر، منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ کے ذریعہ بھیجیں۔
بینک ٹرانسفر کرکے ہم کو ضرور اطلاع دیں۔ بینک اکاؤنٹ کی تفصیلات یہ ہیں:

Account Name: Darul Musannefin Shibli Academy
Bank Name: Punjab National Bank - Heerapatti, Azamgarh
Account No.: 4761005500000051 - IFSC: PUNB0476100

بینک ڈرافٹ درج ذیل نام سے بنوائیں:

Darul Musannefin Shibli Academy, Azamgarh

* زر تعاون ختم ہونے پر تین ماہ کے بعد رسالہ بند کر دیا جائے گا۔
* معارف کا زر تعاون وقت مقررہ پر روانہ فرمائیں۔
* خط و کتابت کرتے وقت رسالہ کے لفافے پر درج خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیں۔
* معارف کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں کی خریداری پر دی جائے گی۔
* کمیشن ۲۵ فیصد ہوگا۔ رقم پیشگی آنی چاہئے۔

Office Mobile: 06386324437
Email: info@shibliacademy.org
Website: http://www.shibliacademy.org

ڈاکٹر فخر الاسلام اعظمی (ڈپٹی ڈائرکٹر) نے معارف پریس میں چھپوا کر دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ سے شائع کیا۔

دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی کا علمی و دینی ماہنامہ

معارف

جلد نمبر ۲۰۹ | ماہ ربیع الثانی ۱۴۴۴ھ مطابق ماہ نومبر ۲۰۲۲ء | عدد ۱۱

فہرست مضامین

دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی
پوسٹ بکس نمبر: ۱۹
شبلی روڈ، اعظم گڑھ (یوپی)
پن کوڈ: ۲۷۶۰۰۱
info@shibliacademy.org

شذرات

معارف کا یہ نومبر کا شمارہ ہے۔دارالمصنّفین کے لیے یہ اس لیے اہم بلکہ ناقابل فراموش ہے کہ اسی مہینے میں علامہ شبلی، مولانا سید سلیمان ندوی اور سید صباح الدین عبدالرحمٰن تینوں نے وفات پائی۔علامہ شبلی کا انتقال ۱۸؍تاریخ کو ہوا اور ٹھیک اسی تاریخ کو سید صباح الدین عبدالرحمٰن ایک حادثہ میں اپنے رب کے حضور حاضر ہوگئے۔۲۳؍تاریخ کو سید صاحب بھی اپنے خالق حقیقی سے جاملے۔علامہ شبلی کے یوم وفات پر ان کی یادوں کا سلسلہ کہنا چاہیے کہ دارالمصنفین کے قیام ہی سے جاری ہے۔ان کی یادیں ہی اصلاً دارالمصنفین کا سرمایہ اور اصل متاع ہیں۔

علامہ شبلی کی حیات کے متعلق عام طور سے کہا جاتا بلکہ یقین کیا جاتا ہے کہ یہ محض شخص واحد کی زندگی نہیں تھی بلکہ حقیقۃً ہندوستان کے مسلمانوں کے علمی، سیاسی، تعلیمی، مذہبی اور قومی احوال واعمال کا سچا اور صاف شفاف آئینہ تھی۔ جہاں پس منظر میں ایک بے قرار وجود کا عکس تھا اور سامنے تغیرات وانقلابات زمانہ کا ایک سمندر موجزن تھا۔ہر جگہ قومی ومذہبی مدوجزر،اداروں اور جماعتوں کی بنا اور پھر ان کا فنا ہوجانا، حکومت سے سخت اختلاف اور اپنے جائز حقوق کے مطالبات، مسجدوں کے خونی منظر، مسلم آبادیوں کو بے اثر اور بے وقعت بنانے کے منصوبے،ان کی زبان اور تہذیب پر تیشے، قیادت کے نام سے قائدین کی کثرت اور پھر سب بے وقعت، غلامی کا درد اور آزادی کی طلب، یہ سب اور بہت کچھ ۱۹۱۴ء یعنی سال وفات شبلی تک قومی داستان کے عنوانات تھے۔ شبلی تھے تو ایک بے قرار دل کی طرح، سارے جہاں کا درد لیے ہوئے، انقلاب گردش گردوں اور مظالم ہائے روزافزوں دیکھتے کبھی زبان بے نوا کے چہرۂ محزوں پر نظر جاتی اور سماعتوں سے یتیموں کے نالہ ہائے جاں گزا ٹکراتے، کبھی رخسار شہیداں پر لہو کی چادریں دیکھتے تو سوچتے کہ چراغ کشتۂ محفل سے دھواں کب تک اٹھتا رہے گا۔فکر تھی کہ احترام سجدہ گاہ قدسیاں کب تک باقی رہے گا، یعنی شبلی خستہ جاں جائے بھی تو کہاں جائے۔ کبھی شدت احساس میں وہ کہتے کہ مجھ کو سستیٔ بازوئے قاتل کی شکایت ہے۔

۱۹۱۴ء سے ۲۰۱۴ء آیا اور وقت کا کارواں اس سے بھی آگے نکل گیا مگر دنیا اور خاص طور پر اپنے ملک کے حالات کو اگر آج علامہ شبلی دیکھتے تو شاید جذبات اور الفاظ میں زیادہ فرق نہیں ہوتا۔لیکن ماتم یہی ہے کہ آج کوئی شبلی نہیں جو قوم کو اپنی شعلہ نفسیوں سے گرم اور اپنی نواسنجیوں سے پر شور رکھنے والا ہو۔ایک

طرف ہر روز ایک نیا ستم ایجاد کرنے کا کارخانہ مسلسل مصروف عمل ہے۔ مذہب، زبان، تہذیب، معاشرت، معیشت، سیاست، تعلیم، صحت، روزگار، کھیل، ہر مقام ایک محاذ میں بدلتا جارہا ہے، جہاں ایک طرف نفرتوں کے اسلحوں سے لیس، زبانیں اور آوازیں ہیں، دوسری طرف ایک حیران، سراسیمہ اور دل شکستہ قوم ہے جو زبان حال سے یہی کہہ رہی ہے کہ ہم اپنے خون سے تمہاری کھیتیاں کب تک سینچتے رہیں گے۔ قوم کی قوم راہبر کی تلاش میں سرگرداں اور جن کو قیادت زیبا تھی وہ خود دریوزہ گری کے مارے ہوئے، قدیم علوم اور دانش حاضر دونوں موجود، لیکن ان کا ارادہ، ان کا منصوبہ، ان کا عزم اور ان کا حوصلہ سب معدوم۔ ایسے میں شبلی کی یاد تو ستائے گی، وہ شبلی جو ارتداد کی خبروں پر ہزار دقتوں کے باوجود ہاتھرس پہنچ کر صرف یہ ثابت کرنا چاہتے تھے کہ اگر ردہ ہے، ارتداد ہے تو ابھی یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ لا ابا بکر لہا۔ آج کوئی شبلی نہیں جو ایک بار پھر پولیٹکل کروٹ لکھ کر سیاست کے نشیب و فراز کے فلسفے کو سمجھا سکے۔ وہ جو وقف کے مسئلہ پر اپنی ہر راحت کو قربان اور اپنے ہر زخم کو مسکان میں بدل دیتے تھے وہ آج نظریاتی تبدیلی کو آبادی کے مسئلہ سے جوڑ کر گھر واپسی کے راستے پر ڈالنے کی نہایت سنگین سازش پر خدا جانے کیا کرتے۔ اب کس کے لیے کہا جائے کہ مسلمانوں پر ہر الزام کے جواب میں کس کا قلم ہے جو نیام سے باہر نکلنے کو بے تاب ہے۔ کس کے لیے کہا جائے کہ اس میں لڑائی کے میدان کو نہیں بلکہ جنگ کے نقشے کو بدل دینے کی صلاحیت ہے۔ کس کے لیے کہا جائے کہ ہوش مند حریفوں کے مقابلے کے لیے اسلام کی صف سے کوئی شیر دل سب سے پہلے نکلے۔ شبلی کی یاد اور ان کے ذکر کے لیے یوم شبلی کے جواز اور ضرورت کا فتویٰ خود اپنے دل سے لینا چاہیے۔

گذشتہ دنوں ملک اور ملت دونوں اپنے غم گساروں اور دردمندوں سے محروم ہونے کے غم کے عالم میں ہے۔ ظاہر ہے روشنی گل ہونے سے اندھیروں کے گھنے ہونے کی گھٹن بڑھ جاتی ہے۔ اس شمارہ میں کئی مرحومین کا مختصر اًذکر آیا ہے۔ بعض دوسرے مسافران آخرت کا ذکر بھی اس لیے ضروری ہے کہ وہ اپنے اپنے میدانوں میں امتیازی شان رکھتے تھے۔ رباب رشیدی لکھنؤ کے ان شاعروں میں تھے جن کو دیکھ کر اور پڑھ کر گذشتہ لکھنؤ کی بہاروں کا اندازہ ہوتا تھا۔ وہ غزل سے نعت پر آئے، گویا مجاز سے حقیقت کا فاصلہ طے کرلیا۔ بڑا پاکیزہ کلام تھا۔ معارف کے گویا پرستار تھے۔ اپنی کتابوں پر تبصرہ دیکھتے تو شکریہ کے لیے ایسے ایسے لفظ استعمال کرتے کہ خود الفاظ کو اپنی قدر و قیمت پر ناز ہونے لگتا۔

جناب عبدالرحیم انصاری حیدرآباد کی مذہبی اور ادبی سرگرمیوں میں سب سے نمایاں نظر آتے۔ دارالعلوم حیدرآباد کے مولانا عاقل حسامی کے وہ عزیز قریب تھے۔ سرکاری حلقوں سے بھی اسی درجہ قریب رہے۔ اچھے عہدوں پر فائز ہوئے اور جو بن سکا اس کو کر بھی لیا۔

چند روز پہلے جناب عزیر شمس کے انتقال کی خبر ملی۔ وہ علمی و تحقیقی صلاحیتوں کا ایسا مجموعہ تھے جس پر صرف رشک ہی کیا جاسکتا ہے۔ زمانہ دراز سے سعودی عرب میں ابن تیمیہ کے کاموں کی تحقیق، تخریج، تدوین کے لیے وقف ہوگئے تھے۔ ان پر ممکن ہے کوئی مفصل تحریر آئندہ شماروں میں آجائے۔ اللہ تعالیٰ ان تمام مرحومین کو اپنی رحمت خاص سے نوازے۔ اعلیٰ علیین میں جگہ عطا فرمائے۔ آمین

گذشتہ دنوں اخبارات میں شبلی اکیڈمی کا ذکر کچھ اس انداز سے ہوا کہ اس کے چند بہی خواہ بے چین ہوگئے۔ دارالمصنفین کے پریس میں ۱۹۱۷ء سے لیتھو کی دو مشینوں سے طباعت کا کام ہوتا رہا۔ برسوں قبل آفسیٹ مشین کے آجانے کے بعد یہ مشینیں معطل اور زنگ آلود ہوگئیں۔ خیال ہوا کہ رکھے رکھے یہ بالکل ہی ضائع نہ ہوجائیں۔ ذمے داران دارالمصنفین نے کافی مشوروں کے بعد ان میں سے ایک مشین کو فروخت کرنے کا فیصلہ کیا جبکہ اس دوسری مشین کو رکھ لیا گیا جس پر سیرت النبی کی طباعت ہوئی تھی۔ ایک مشین کی کچھ تصویریں جب وائرل ہوئیں تو بعض حضرات کو یہ عمل پسند نہیں آیا حالانکہ جس مشین کا فوٹو شائع کیا جارہا تھا وہ اب بھی دارالمصنفین میں موجود ہے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ یہ بھی ان کی محبت کا ایک انداز ہے۔ لیکن اس سے ذمہ داروں کی نیت اور فیصلہ پر شک کرنا بھی کسی درجہ انصاف کی بات نہیں۔ یہ آثار قدیمہ کی حفاظت سے بے اعتنائی کا بھی معاملہ نہیں۔ الحمدللہ ایک صدی سے زیادہ گزرنے پر ہمارے بزرگوں کی بہت سی یادگاریں ہیں جن کو ادارہ اپنے سینے سے لگائے ہوئے ہے اور آئندہ بھی اللہ تعالیٰ کی ذات سے امید ہے کہ حفاظتِ آثار و روایات کی ذمہ داری پوری امانت کے ساتھ ادا کی جاتی رہے گی۔

***

مقالات

ہندوستان میں قرآن مجید کی ابتدائی طباعتوں کی تاریخ اور تقریباً ۱۳۰۰ھ تک شائع صحیح ترین اور اہم ترین طباعتیں

مولانا نورالحسن راشد کاندھلوی

مفتی الٰہی بخش اکیڈمی، کاندھلہ

nhrashidkandhlavi@yahoo.com

قرآن کریم، کلام الٰہی اور کائنات کی ایک ایسی دائمی وابدی حقیقت ہے، جس کے متعلق صاف لفظوں میں اعلان فرمادیا گیا ہے: "إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَإِنَّا لَهُ لَحَافِظُونَ" (سورۂ حجر :۹) (ہم نے آپ اتاری ہے یہ نصیحت، اور ہم آپ اس کے نگہبان ہیں) (ترجمہ شیخ الہند)۔

اس آیت شریفہ کے نازل ہونے کے وقت سے آج تک، وقت کی گردشوں نے ہر آن اس اعلان کی صداقت کا مشاہدہ کیا ہے کہ ماہ وسال کا سفر، چاند وسورج کا طلوع وغروب، زمانہ کے انقلابات اور مخالفین دین اسلام کی مسلسل تردید وکوشش، اس آسمانی اعلان اور وحی الٰہی کو چیلنج کرنے سے ہمیشہ عاجز و قاصر رہی اور یہ بھی عجیب بات ہے کہ گزرتے وقت کے ساتھ ساتھ، قرآن مجید کی ترتیب کی قدیم سے مطابقت اور اس کے الفاظ کی سچائی کے نئے نئے گواہ اور تحریری تصدیقات سامنے آرہی ہیں۔

تقریباً آٹھ، دس سال پہلے، حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے مبارک عہد کا قرآن کریم، ایک مغربی ادارے کی لائبریری سے برآمد ہوا تھا، جس کی ماہرین تحریرات وسائنس نے تصدیق کی تھی کہ یہ حضرت صدیقؓ کے عہد کا ہوسکتا ہے۔

حضرت عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے جو مصحف مرتب کرائے تھے، اس میں سے دو، اس وقت محفوظ ہیں۔ ایک تاشقند (ازبکستان) میں اور دوسرا توپ کاپی میوزیم (ترکی) میں۔ دونوں کے جوں کے توں عکس بھی شائع ہوکر عام ہوچکے ہیں۔ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور حضرات حسنینؓ سے منسوب قرآن کریم، یا ان کے اجزاء، دنیا کی متعدد لائبریریوں کے لئے باعث شرف وسعادت ہیں۔ عہد صحابہؓ سے اس وقت تک کوئی دور ایسا نہیں گزرا، جس میں دنیا کے مختلف ملکوں اور شہروں میں قرآن کریم کی نقل وکتابت نہ ہورہی ہو اور یہ روایت آج ہمارے دور تک، بلاکسی وقفے کے جاری ہے۔

ہر صدی میں لکھے ہوئے بیشمار قرآن کریم، پوری دنیامیں موجود ہیں۔

قرآن مجید کے قدیم خطی نسخوں کے عکس ویانا (آسٹریا) یونیورسٹی کی لائبریری نے شائع کئے تھے، ان میں سے چند قرآن مجید، قدامت اور تاریخی استناد کے لحاظ سے نہایت اہم، دستاویزی اور تاریخی ہیں۔[1]

جب تک پریس ایجاد نہیں ہوا تھا اور طباعت کا نظام سامنے نہیں آیا تھا، اس وقت تک خطاط، خوش نویس، علماء، صلحاء اور عام مسلمان اپنی مہارت فن، صناعی، آرائش وزیبائش کی پوری صلاحیت، قرآن کریم کی تحریر وکتابت میں خرچ کرڈالتے تھے۔ امت مسلمہ کے ہزارہا ہزار اصحاب واہل ذوق نے، قرآن مجید کے ایسے ایسے بیشمار نسخے تحریر کئے، کہ جن کی نقاشی، فنکاری اور آرائش وزیبائش، آج بھی پوری طرح منور وتابناک ہے اور اس قدر تروتازہ نظر آتی ہے، جیسے لکھنے والا آج ہی بلکہ ابھی لکھ کر، اپنے کام سے فارغ ہو کر اٹھا ہے۔ ان نسخوں کا حسن، کتابت، نقاشی وگل کاری، الفاظ کی گرفت سے بالا اور کلمات تحسین سے ماورا ہے۔ ایک ایک نسخہ ایسا ہے کہ اس پر، دل وجان قربان کرنے کو جی چاہتا ہے۔

اور یہ بھی نظام قدرت کی عجیب کارفرمائی ہے، کہ جب یورپ کے اہل فن اور اہل ہنر نے کتابوں کو قلم سے نقل کرنے کی پرانی روایت کو ترک کرکے، ان کی اجتماعی کاپیوں کی تیاری اور طباعت کے طریقوں کی منصوبہ بندی کی اور اس نئے طریقے سے کتابوں کو زیادہ تعداد میں تیار کر کے عام کرنے کا ارادہ کرلیا، اسی وقت سے قرآن مجید بھی سب سے پہلے طبع کئے جانے اور سب سے بڑھ کر شائع اور فروخت ہونے والی کتابوں میں شامل ہے۔

طباعت کے فن کی ابتدا: طباعتوں کے فن کو بنیادی طور پر دو حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ پہلا دور، طباعت کے طریقوں کی ایجاد اور لکڑی کے فرموں کے ذریعہ، کسی ایک کتاب اور بعد میں اخبارات کے چند شماروں یا نسخوں کی تیاری کا تھا۔ یہ طریقہ پندرہویں صدی عیسوی (دسویں صدی ہجری) کے آخر میں، ایک دو ذاتی تجربات سے شروع ہوا تھا۔ اس وقت لکڑی کے خاص طرح کے فرمے بنا کر، ان کے ذریعہ سے کسی ایک کتاب کے چند نسخے تیار کرلینے کے سلسلے کا آغاز ہوا۔ یہی طباعت کے فن کی ابتدا تھی۔ اس میں شروع شروع میں چند نسخے مشکل سے چھپتے تھے۔ آہستہ آہستہ اس کو ترقی ہوئی، لیکن جو چیزیں اس کے ذریعے سے عام کی گئیں، ان میں متعدد طباعتیں، قرآن مجید کی بھی تھیں۔

---

[1] یہ اطلاع پاکستان کے محقق جناب ڈاکٹر اکرام چغتائی صاحب، لاہور نے فراہم کی۔

دنیا بھر میں شائع سب سے پہلا قرآن مجید اور چند ابتدائی اہم طباعتیں: اب تک کی معلومات کے مطابق، سب سے پہلا قرآن مجید وینس (Venice) سے سن ۱۵۳۷-۱۵۳۸ء [۹۴۴ھ] میں شائع ہوا تھا۔ اس کو تجارتی مقاصد سے شائع کیا گیا تھا، مگر اس میں بہت غلطیاں تھیں، اس لئے خلافت اسلامیہ ترکی کے حکم پر، اس کے نسخے ضائع کرادیے گئے تھے، تاہم اس طباعت کا ایک نسخہ اب بھی موجود ہے۔

اس کے بعد کئی تاجروں نے قرآن کریم شائع کرنے کی کوشش کی۔ مصاحف سب طرح کے تھے۔ صرف متن قرآن مجید اور تفسیری افادات اور متعلقہ فوائد کے ساتھ، جو علیحدہ ترتیبات پر ۱۶۹۴ء [۱۱۰۶ھ] میں جرمنی کے شہر ہیمبرگ سے، ۱۶۹۸ء [۱۱۱۰ھ] سے، ۱۷۲۱ء [۱۱۳۴ھ] تک چھپے۔ ان طباعتوں کو پادریوں، عیسائی مشنریوں اور تاجروں نے، اپنے اپنے مقاصد کے لئے اہتمام کیا تھا۔ روس کی ملکہ کیتھرین (Catherine) نے اپنے ملک کے مسلمانوں کے لئے، کئی مرتبہ قرآن کریم شائع کرایا۔ یہ اشاعتیں قازان (Kazan) کے مطابع سے، ذمہ دار مسلمانوں اور اہل علم کی نگرانی میں شائع ہوئی تھیں، جو پوری دنیا میں قرآن کریم کی عمومی اشاعتوں کا آغاز تھا۔

ابتدائی طریقۂ طباعت میں تبدیلی: سترہویں صدی عیسوی (گیارہویں صدی ہجری) کے وسط میں، قدیم طریقۂ اشاعت میں ایک بڑی اور تیز رفتار تبدیلی ہوئی، جس میں لکڑی کے فریم اور حروف کی جگہ، چھپائی لوہے کے حروف (Metal Letters) سے شروع کی گئی۔ اس میں کئی طرح کی سہولتیں تھیں۔ اس طریقۂ طباعت نے تیزی سے ترقی کی اور یہ طریقۂ طباعت جلد ہی یورپ کے کئی ملکوں سے گزرتا ہوا نئے تجربات اور تازہ اختراعات کا اضافہ کرتا ہوا، ہندوستان تک آ گیا۔

ہندوستان میں پریس: ہندوستان میں پریس، اگرچہ سولہویں صدی عیسوی میں آ گیا تھا، مگر وہ عموماً غیر ملکیوں، پرتگالیوں اور فرانسیسیوں کی ملکیت میں تھا، جس پر ان کی چند کتابیں کبھی کبھی چھپتیں اور دو تین اخبارات بھی مغربی زبانوں کے، ان مطابع میں چھپتے رہے۔ اٹھارہویں صدی عیسوی کے بالکل آخر، تقریباً ۱۲۰۰ھ کے بعد، مطابع کے تجارتی استعمال کی ابتدا ہوئی۔ یہ پریس کلکتہ اور ہوگلی میں قائم کئے گئے تھے۔ ان کے ذریعے، انیسویں صدی کے بالکل آغاز میں، سب سے پہلے جو کتابیں چھپیں اور لوگوں کے سامنے آئیں، ان میں قرآن کریم بھی شامل ہے۔

ہندوستان میں قرآن مجید کی سب سے پہلی طباعت: ہندوستان میں سب سے پہلے کس مطبع کو، قرآن

مجید شائع کرنے کی عزت وسعادت حاصل ہوئی، اس کا صحیح علم نہیں۔ مگر ہندوستان میں انگریزوں کے قائم کئے ہوئے مشہور تعلیمی، تصنیفی ادارے، فورٹ ولیم کالج[۲] (آغاز۔ ۱۰؍جولائی ۱۸۰۰ء) کے نامور استاذ، مشرقی ادبیات اور ہندوستانی کتابوں سے گہرا دلی شغف رکھنے والی شخصیت، جان گل کرسٹ (John Gilchrist) نے دوسری کتابوں کی تحقیق، تصحیح، ترجمہ اور طباعت کے علاوہ، کئی اہل علم اصحاب کو، قرآن شریف کے اردو ترجمے کے لئے مامور کیا تھا۔ ان صاحبان نے دوسال کی مسلسل محنت کے بعد قرآن شریف کا ایک نیا اردو ترجمہ مکمل کرلیا تھا۔ یہ ترجمہ ۹؍رمضان ۱۲۱۹ھ (۴؍دسمبر ۱۸۰۴ء) میں چھپ کر آیا۔ اگرچہ گل کرسٹ کی ہندوستان سے واپسی کے بعد، کالج کے ذمے داروں نے اس کام کو ناپسندیدہ قرار دے کر، اس کے تمام مطبوعہ نسخے اور طباعت کے لئے تیار کئے گئے فرمے، ضائع کرادیے تھے، مگر اس کا ایک مکمل نسخہ انڈیا آفس لائبریری، لندن پہنچ گیا تھا، جو آج بھی موجود و محفوظ ہے۔[۳] اس ترجمے کی اشاعت کا تذکرہ، یہ جاننے کے لئے ضروری ہے کہ قرآن کریم کے اردو ترجمے کی اشاعت، علمی، معاشی دونوں حیثیتوں سے اسی وقت مفید ہوسکتی تھی جب اس سے

---

[۲] (۱) بعض معلومات کے لئے ملاحظہ ہو:

الف: یوسف سرکیس، معجم المطبوعات العربیہ والمعربہ۔ کالم: ۱۵۰۰-۱۵۰۱، جلد: ۱ (عکس طبع اول، دار صادر۔ بیروت، ب۔ت)

ب: انس خلدوف، دلیل المطبوعات العربیہ فی روسیا۔ ۱۷۸۷ء-۱۹۱۷ء۔ ص: ۳۱۶ تا ص: ۳۲۰ ومابعد (مرکز جمعۃ الماجد۔ دبی۔ ۱۴۲۹ھ۔ ۲۰۰۸ء)

(۲) ضیاء الدین لاہوری، اس کے مفصل تعارف کے لئے دیکھئے: فورٹ ولیم کا ترجمۂ قرآن کریم، مجلہ بازیافت، لاہور۔ شمارہ: ۳ (جولائی، دسمبر ۲۰۰۳ء) ص: ۱۰۱۔ ۱۱۴۔ عتیق احمد صدیقی نے جان گل کرسٹ اور اس کا عہد (دہلی: ۱۹۷۹ء) میں ص: ۱۴۹ میں اور ڈاکٹر عبیدہ بیگم نے بھی، فورٹ ولیم کالج کی ادبی خدمات ص: ۲۳۳-۲۳۹ (لکھنو: ۱۹۸۳ء) میں اس ترجمے کے ایک قلمی نسخے کا تعارف کرایا ہے، جو ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ کی لائبریری میں موجود ہے۔

[۳] (۱) گارساں دتاسی، خطبات گارساں دتاسی، اورنگ آباد: ۱۹۳۵ء، ص: ۱۷۸۔

دہلی میں قائم پہلا پریس مطبع مطیع الرحمن یا سلطانی پریس تھا۔ یہ دونوں علیحدہ علیحدہ کام کرتے تھے۔ مطبع سلطانی قلعہ معلی میں حافظ عبداللہ کیرانوی کی نگرانی میں کام کرتا تھا۔ مطبع سلطانی کی متعدد مطبوعات ہمارے ذخیرے میں موجود ہیں۔

پہلے اصل قرآن شریف چھپ کر عام ہو چکا ہو۔

بہر حال، اس اشاعت سے یہ فیصلہ کرنے میں مدد ملتی ہے کہ برصغیر ہند و پاکستان میں، قرآن کریم کی طباعت، تقریباً ۱۸۰۰ء (۱۲۱۵ھ) میں شروع ہو گئی تھی۔ افسوس ہے کہ مجھے اس وقت کا مطبوعہ قرآن شریف نہیں ملا۔

اٹھارہویں صدی میں، قرآن شریف کی طباعت کا سلسلہ جیسے ہی شروع ہوا، وہ خوشبو اور ہواؤں کی طرح فضا میں پھیل گیا اور جو بھی اچھے پریس قائم ہوتے رہے، وہ قرآن کریم کی طباعت و اشاعت کا اہتمام کرتے رہے۔

۱۸۲۰ء تک قرآن مجید کی طباعتیں: ہندوستان کے قدیم مطابع کی اور ان کی مطبوعات کی تفصیلات دریافت نہیں، مگر مختلف جزوی اطلاعات سے یہ ضرور معلوم ہوتا ہے کہ ۱۸۲۰ء تک خصوصاً کلکتہ وغیرہ کے مطابع سے، قرآن کریم کی طباعت و اشاعت عام ہو چکی تھی۔ جیسے جیسے وقت آگے بڑھا، طباعتوں کا اوسط اور ان کا معیار بڑھتا رہا۔ کلکتہ اور بنگال کے مطابع اپنی کتابیں نسخ میں چھاپتے تھے۔ چند مطابع نستعلیق میں بھی طباعت کرتے تھے، کلکتہ میں یہی روش دیر تک رہی۔

شمالی ہند میں پہلا پریس: شمالی ہند، خصوصاً دہلی میں طباعت کی ابتدا الیتھو گراف سے ہوئی۔ گارساں دتاسی کی اطلاع کے مطابق، دہلی میں پہلا پریس ۱۸۳۷ء (۱۲۵۳ھ) میں قائم ہوا۔[۴] اس کے بعد دہلی میں مطابع قائم کرنے کا سلسلہ تیزی سے مقبول اور عام ہونا شروع ہو گیا تھا۔ یہ مطابع اشاعتی ادارے تھے اور کتابوں کے علاوہ، کثرت سے قرآن کریم کے اردو ترجمے بھی شائع کرتے رہتے تھے۔

مطبع دارالسلام دہلی اور اسعد الاخبار، آگرہ: ۱۸۳۷ء سے ۱۸۵۰ء تک ایسے بیسیوں مطابع کی اطلاعات ملتی ہیں، جو قرآن کریم شائع کرتے تھے، اور ان کی کثرت سے اشاعت و فروخت ہوتی تھی، جس میں مطبع دارالسلام دہلی (جو خاصا بڑا ناشر اور تاجر کتب تھا) اور مطبع اسعد الاخبار، آگرہ بہت ممتاز تھے۔ دونوں نے قرآن مجید کی عمدہ طباعتوں پر خاص توجہ کی اور پابندی سے مسلسل، عمدہ چھوٹے بڑے قرآن مجید شائع کرتے رہے۔

دارالسلام، دہلی کی طباعت قرآن مجید: مطبع دارالسلام نے ۱۸۵۰ء (۱۲۶۷ھ) سے پہلے، جیبی قرآن شریف، حمائل کی طباعت کا سلسلہ شروع کیا تھا، جس کی اور مطابع نے پیروی کی۔ مطبع اسعد الاخبار اور

---

[۴] عتیق احمد صدیقی (مرتب)، صوبہ شمالی و مغربی کے اخبارات و مطبوعات، طبع اول۔ دہلی، ص: ۲۴۔

دوسرے مطابع بھی قرآن کریم کے علاوہ، حمائل شریف کثرت سے چھاپے۔ان دونوں کی قرآنی طباعتوں کے تعارف پر، علیحدہ مستقل مقالے کی ضرورت ہے۔

مطبع دارالسلام سے جو قرآن مجید شائع ہوئے،ان میں قدیم ترین معلوم طباعت، جس کے ساتھ شاہ عبدالقادر کا ''موضح قرآن'' بھی چھپا تھا، ۲۵ر رمضان المبارک ۱۲۶۲ھ (اگست ۱۸۴۶ء) کو مکمل ہوا۔ یہ طباعت، جو خاصی بڑی پیمائش کے، چھ سو بتیس ۶۳۲ صفحات پر مشتمل ہے، میری نظر سے گذری ہے۔

۱۸۵۰ء سے پہلے شمالی ہندوستان کے مطابع میں، قرآن کریم کی اعلیٰ درجے کی متنوع اقسام کے، قرآن کریم کی طباعتوں کی مانگ کثرت سے ہونے لگی تھی، یہاں تک کہ قرآن مجید، سلسلۂ طباعت میں سب سے اوپر پہنچ گئے تھے۔ ۱۸۴۸ء کی مطبوعات اور پریس کی، سرکاری رپورٹ میں لکھا ہے:

طبّی کتابوں اور قرآن کی سب سے زیادہ مانگ معلوم ہوتی ہے[۵]

قرآن مجید کی کثرت طباعت اور بڑی قیمتیں: کثرت طباعت اور بہت بھاری قیمت ہونے کے باوجود، قرآن مجید کی تیز رفتار فروخت کا اس سے اندازہ کیجیے، کہ مطبع قادری آگرہ نے ۱۸۴۹ء (۱۲۶۶ھ) میں چھوٹے سائز کی حمائل بارہ سو (۱۲۰۰) کی تعداد میں شائع کی تھی، جس کی فی نسخہ، پانچ روپئے آٹھ آنے قیمت تھی، مگر قرآن کریم کی اس قدر مانگ تھی کہ اس مہنگی قیمت کے باوجود، وہ تمام نسخے ایک سال میں فروخت ہوگئے۔ اس کے دوسرے سال ۱۸۵۰ء (۱۲۶۷ھ) میں اسی پریس نے ایک اور قرآن شریف، بارہ سو کی تعداد میں چھاپا، جس کی قیمت فی نسخہ پانچ روپئے تھی۔ یہ تمام نسخے بھی ایک سال میں ہدیہ ہوگئے۔

اسی مطبع اسعد الاخبار آگرہ نے، ۱۸۴۸ء (۱۲۶۵ھ) میں جیبی قرآن شریف (حمائل) شائع کی، جس کا ہدیہ آٹھ روپئے تھا۔ دس مہینے میں اس طباعت کے آدھے نسخے نکل گئے۔ اسعد الاخبار پریس نے ۱۸۵۰ء (۱۲۶۷ھ) میں بارہ سو پچیس حمائل شریف شائع کیں، جس میں سے گیارہ سو نسخے تقریباً دس مہینے میں نکل گئے۔

---

[۵] عتیق صدیقی ص: ۱۹۳۔ ۱۹۴۔ ۱۹۵۔ یہاں یہ یاد رہنا چاہئے کہ جس وقت کی یہ بات ہو رہی ہے اس وقت، اوسط درجہ کے اچھے گھرانے کا ماہانہ خرچ تین روپئے سے زیادہ نہ ہوتا تھا، مزدوری آدھا یا ایک پیسہ ہوتی تھی، دہلی میں اس وقت ۱۸۴۶۔۱۸۴۸ء میں سونا ایک روپیہ تولہ تھا اور ایک ہندوستانی روپئے کے سو پونڈ ملتے تھے۔

مطبع دارالسلام، دہلی کی قرآن کی اشاعتیں: اسی طرح دہلی کے سب سے پہلے مطابع میں سے ایک، مطبع دارالسلام نے ۱۸۴۹ء(۱۲۶۶ھ) میں ایک قرآن شریف کے چار سو بائیس نسخے شائع کئے، جس کی قیمت دو روپئے فی نسخہ تھی۔ یہ تمام نسخے بھی ایک سال میں فروخت ہو گئے تھے۔اسی مطبع نے اسی سال میں ایک حمائل بھی شائع کی، جو چھ سو کی تعداد میں چھپی تھی اوراس کے بھی تمام نسخے فروخت ہو گئے۔اسی مطبع نے ۱۸۵۱ء(۱۲۶۸ھ) میں ایک قرآن شریف چھ سو کی تعداد میں شائع کیا تھا، جو غالباً اسی سال میں فروخت ہو گیا۔ پھر اسی مطبع نے ۱۸۵۲ء(۱۲۶۸-۶۹ھ) میں ایک حمائل شریف نو سو کی تعداد میں شائع کیں۔ اس کے بھی تمام نسخے ایک سال میں نکل گئے تھے۔ایک اور معروف مطبع دلی اردو اخبار پریس تھا، اس نے بھی قرآن شریف کو کئی طرح سے، کئی مرتبہ شائع کیا، اس کی فروخت بھی کم نہیں رہی۔

۱۸۵۰ء میں گارساں دتاسی نے، اپنے پہلے خطبے میں کہا تھا: ''علاوہ دوسری کتابوں کے قرآن شریف کے متعدد ایڈیشن، عربی اور اردو میں شائع ہوئے ہیں''۔[۶]

اسی طرح کی اور بہت سی مثالیں ہیں۔اس دور میں کلکتہ سے میرٹھ اور دہلی تک بہت سے مطابع تھے، جو اپنے اپنے وسائل اور پڑھنے والوں کی طلب اور حیثیت کے مطابق، چھوٹے بڑے قرآن کریم اور حمائل مسلسل شائع کرتے رہتے تھے، ان کی روداد طویل ہے، یہاں ان سب کا تعارف ممکن نہیں ہے۔

طباعت قرآن مجید کا یہ سفر آہستہ، آہستہ آگے بڑھتا ہوا، بہتر سے بہتر کی جانب ترقی کرتا رہا۔ان مطابع کے ذریعہ سے، بلا مبالغہ بیسیوں طرح کے، بلکہ طرح طرح کے قرآن مجید شائع ہوتے رہے، مگر ان میں سے چند قرآن مجید وہ ہیں، جو اس زنجیر کی سنہری کڑی شمار کئے جانے چاہئیں۔

مولانا احمد علی محدث سہارنپوری کا شائع کیا ہوا، بے نظیر قرآن مجید: ۱۸۵۰ء کے بعد جو قرآن کریم شائع ہوئے، ان میں اپنی خصوصیات میں ممتاز و منفرد، صحت کے لحاظ سے بے نظیر اور اعلیٰ درجے کی طباعت کا قرآن شریف وہ تھا، جس کو مولانا احمد علی محدث سہارنپوری نے، اپنے مطبع احمدی، دہلی سے ۱۲۷۰ھ (۱۸۵۳-۵۴ء) میں شائع کیا تھا۔

اس قرآن مجید پر، اس وقت کے ممتاز ترین علماء، اصحاب درس و تحقیق اور اہل نظر کی تصدیقات اور مہریں ثبت ہیں، جس میں شاہ احمد سعید مجددی، حضرت شاہ عبدالغنی مجددی، مولانا سید محمد (امام جامع

---

[۶] گارساں دتاسی، خطبات گارساں دتاسی پہلا خطبہ حیدر آباد: ۱۹۳۵ء ص: ۱۳

مسجد دہلی)، شاہ عبدالغنی اور شاہ احمد سعید کے خاندان کے متعدد علماء اور خود مولانا احمد علی محدث اور مولانا عبدالعلی میرٹھی وغیرہ کے نام شامل ہیں۔

یہ قرآن مجید پانچ سو بتیس (۵۳۲) صفحات پر مشتمل ہے۔اس کے حاشیوں پر، معتبر تفسیروں کے حوالے سے، ہر ایک سورہ کی آیات کی تعداد، ان کے مکی، مدنی ہونے میں اتفاق واختلاف، اور وقوف سجاوندی سے تصریحات اضافہ کی گئی ہیں۔

اس کے آخر میں مولانا سہارنپوری کے قلم سے، مفصل وجہ اشاعت، اس قرآن مجید کی خصوصیات کا تذکرہ اور اہتمام صحت کی وضاحت ہے۔اختتام پر مولانا رعایت الحق سہارنپوری (شاگرد حضرت شاہ عبدالغنی مجددی) کا مرتبہ قطعہ تاریخ بھی درج ہے۔یہ تحریر اور قطعہ تاریخ فارسی میں ہے۔

اس تحریر کے بعد، مقدمہ وقوف سجاوندی اور رسالہ دربیان مخارج وحروف ہے۔وقوف سجاوندی کا یہ نسخہ، جس پر مولانا احمد علی نے اعتماد فرما کر، یہاں شامل کیا ہے، اس دور کے ممتاز ترین ماہر قرأت ورسم قرآنی، قاری نسیم رام پوری کا نسخہ ہے، جس پر قاری صاحب کے قلم سے بیشمار اضافے، وجوہ قرأت اور متن وقف سجاوندی پر اصل سے کئی گنا اضافے اور توضیحات درج تھیں۔اس پر مولانا محدث سہارنپوری نے علامہ بحرالعلوم (غلام مصطفی تھانیسری) کی تحقیقات سے اضافے بھی کئے ہیں، ان خصوصیات والتزامات کی وجہ سے یہ نسخہ، ہندوستان کے اعلیٰ ترین نسخوں میں، بے نظیر و بے مثال نسخہ شمار کیا جاتا ہے۔

مطبع احمدی کا یہ قرآن مجید بے حد پسند کیا گیا اور اس کی دوسری اشاعت غالباً اسی سال میں آگئی تھی۔ اس کے ساتھ ہی ۱۸۵۷ء کی تحریک نمودار ہو گئی، جس میں مولانا سہارنپوری کا مطبع احمدی تباہ و برباد ہو گیا تھا۔تقریباً دس سال کے بعد اس مطبع کو دوبارہ میرٹھ میں قائم کیا گیا۔میرٹھ کے مطبع احمدی سے بھی یہ قرآن مجید، ۱۲۸۵ھ (۱۸۶۸-۶۹ء) میں ایک مرتبہ اور شائع ہوا۔

اس اشاعت پر، مولانا احمد علی محدث کے علاوہ، دس علماء اور قراء کی مہریں ثبت ہیں، جو اس کی اشاعت کی تنقیح مزید اور تصحیح مکرر کا اعلان کر رہی ہیں۔نہایت دقت نظر سے، کامل توجہ اور تصحیح کی وجہ سے یہ قرآن مجید نہایت عمدہ اور بے نظیر ہو گیا تھا اور صاحب کمال پڑھنے والوں کے لئے ایسی مثال بن گیا تھا کہ بعد میں اکثر ناشرین نے طباعت کے لئے اسی پر اعتماد کیا اور کہا جا سکتا ہے کہ ۱۲۷۰ھ سے عصر حاضر تک، جو قرآن مجید، اہتمام صحت کے ساتھ چھاپے گئے ہیں، وہ تمام اسی کی نقل ہیں۔

ہوگلی یا کلکتہ میں قرآن کریم کے اردو ترجموں کی طباعت کا آغاز، فورٹ ولیم کالج کے اس اردو ترجمہ

سے ہو چکا تھا، جو گل کرسٹ نے مرتب اور شائع کرایا تھا۔ اس کے بعد شیخ مراد اللہ سنبھلی کی تفسیر چھپی۔ تیسری کتاب یا ترجمہ، جس نے ترجمہ اور تفاسیر کی دنیا میں نیا نشان اور سنگ میل قائم کیا، وہ حضرت شاہ عبدالقادر کا موضح قرآن ہے۔

موضح قرآن کی پہلی اشاعت ۱۲۴۵ھ: موضح قرآن، پہلی مرتبہ سید عبداللہ بن سید بہادر علی کے مطبع احمدی، کلکتہ سے جمادی الاول ۱۲۴۵ھ۔ نومبر ۱۸۲۹ء میں شائع ہوا۔ موضح قرآن کی ایسی غیر معمولی پذیرائی ہوئی اور اس کو، اس طرح ہاتھوں ہاتھ لیا گیا، کہ پورے برصغیر میں اس کا غلغلہ بلند ہو گیا۔ کلکتہ سے معمولی وقفے سے کم سے کم تین مرتبہ چھپا۔ اس کے بعد اور مطابع میں اس کی چھپائی اور فروخت کا گویا مقابلہ شروع ہو گیا تھا۔ مطبع دارالسلام دہلی نے ۱۸۴۰ء (۱۲۵۶ھ) کے قریب، اس کو کئی طرح سے چھاپا۔ دہلی اردو اخبار پریس سے بھی اسی سال میں طباعت ہوئی۔ اسعد الاخبار، آگرہ نے بھی شائع کیا اور بھی کئی مطابع نے اس کی اشاعت و فروخت کا سامان کیا۔

تفسیر فتح العزیز کی پہلی اشاعت ۱۲۴۸ھ: اسی سلسلے کا ایک بڑا قدم، حضرت شاہ عبدالعزیز کی مشہور یادگار، تفسیر فتح العزیز کی اشاعت ہے۔ تفسیر فتح العزیز فارسی کا انتیسواں پارہ (تبارک الذی) شوال ۱۲۴۸ھ (۱۸۳۳ء) میں چھپا تھا۔ ان تینوں کتابوں کی اشاعت سے، پورے ملک میں قرآن کریم کے پڑھنے، سمجھنے کا ذوق پیدا ہوا، اور کثرت سے مختلف تفسیروں، ترجموں کی اشاعت کا سلسلہ شروع ہوا، جو آج تک جاری ہے، اور ہم قرآن مجید کے حوالے سے، نئی تحریری معلومات وافادات سے آنکھیں ٹھنڈی اور دامن مراد پُر کر رہے ہیں۔

ترجمہ منسوب شاہ رفیع الدین کی پہلی اشاعت ۱۲۵۶ھ: اردو میں قرآن مجید کا، دوسرا ترجمہ حضرت شاہ رفیع الدین سے منسوب ہے۔ یہ ترجمہ سب سے پہلے، مطبع اسلام، کلکتہ سے ۱۲۵۶ھ (۱۸۴۰ء) میں دو جلدوں میں شائع ہوا تھا۔ دہلی اردو اخبار پریس سے اس کی دوسری اشاعت آئی۔

الفوز الکبیر حضرت شاہ ولی اللہ کی سب سے پہلی اشاعت: حضرت شاہ ولی اللہ کی مشہور و ممتاز تالیف الفوز الکبیر بھی، ان ہی دنوں میں مطبع احمدی کلکتہ سے ۱۲۴۵ھ میں چھپی تھی، جو اس کی سب سے پہلی طباعت تھی۔

مطبع نظامی کی طباعتیں: قرآن حکیم کی اعلیٰ اور صحیح ترین نسخوں کی اشاعت میں، مطبع نظامی کانپور کا بہت غیر معمولی حصہ ہے۔ مطبع نظامی کانپور نے قرآن کریم کی طباعت پر توجہ کی، اور اس کو ہر پہلو سے کہیں سے کہیں پہنچا دیا۔ مطبع نظامی نے کئی طرح کے چھوٹے بڑے قرآن کریم شائع کئے، جن میں سے دو

تین وہ ہیں، جو ہندوپاکستان کے ناشرین قرآن اور قرآن شریف پڑھنے پڑھانے والوں کے لئے سنداور صحت کی اعلیٰ درجہ کی ضمانت اور بے مثال ثابت ہوئے۔

یہ اسی مطابع کے قرآن شریف ہیں، جو نظامی، مثل نظامی اور حافظی کے نام سے، ہندوستان، پاکستان، بنگلہ دیش اور دنیا کے دوسرے علاقوں میں چھپتے اور پڑھے جاتے ہیں۔

مطبع نظامی کانپور نے، مولانا احمد علی محدث سہارنپوری کے شائع کئے ہوئے نسخوں کو بنیاد بنا کر، ان پر مزید محنت اور توجہ کی اور ان کی اس حد تک تصحیح کی کہ اس میں غلطی کی تلاش تقریباً ناممکن ہوگئی۔

مطبع نظامی نے وقفہ وقفہ سے کئی طرح کے چھوٹے بڑے قرآن شریف شائع کئے، جس میں سے ہر ایک کی اپنی خصوصیات اور ایک امتیاز تھا۔ سب سے بڑی خوبی تصحیح کا وہ اہتمام ہے، جس کی بعد میں کہیں مثال نظر نہیں آتی۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ بعد میں قرآن شریف کے اکثر شائع کرنے والوں نے نظامی کے قرآن پاک سامنے رکھے اور ان ہی کا عکس یا پرنٹ شائع کئے۔

ہند، پاکستان کے علاوہ عرب ممالک اور یورپ میں بھی، حافظی قرآن کے نام سے جو قرآن شریف چھپتے ہیں، وہ مطبع نظامی کی نقل اور صدقۂ جاریہ ہیں۔

پندرہ سطری صفحہ اور ہر صفحہ آیت پر ختم، جس سے قرآن کریم کے حفظ کرنے والوں کو نہایت مدد ملتی ہے۔ یہ بھی اسی مطبع کی ایجاد وترتیب ہے۔

مطبع نظامی نے ۱۲۷۹ھ (۱۸۶۲-۶۳ء) میں وہ قرآن شریف شائع کیا، جو بے نظیر ثابت ہوا۔ یہ قرآن کریم بڑی تختی کا ہے، جس کے حاشیے پر علامہ بحر العلوم تھانیسری کے حوالے سے رسم قرآن، آیات قرآنی اور ہر ایک سورہ کے کلمات، حروف ورکوعات کی صراحت ہے۔ اس کا اختتام، ناشر قرآن کریم حاجی عبدالرحمن شاکر کے قلم سے ہے۔ یہ ایک مختصر سی معذرت ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس قرآن کریم کی تصحیح میں مولانا احمد علی محدث سہارنپوری کا شائع کیا ہوا نسخہ، ناشر کے سامنے ہے۔ اس قرآن مجید کی طباعت رمضان ۱۲۷۹ھ (فروری ۱۸۶۳ء) میں مکمل ہوئی تھی۔

حاجی عبدالرحمن شاکر صاحب نے، اس کے ساتھ ہی دو قرآن شریف اور شائع کئے تھے، جن میں متوسط پیمائش کا ایک قرآن شریف وہ تھا، جس پر اس وقت کے جید ترین علماء، قراء کی تصحیحات اور مہریں ثبت ہیں۔ اس کہکشاں میں مولانا سعادت علی، بانی مدرسہ مظاہر علوم سہارنپور (جو شاہ عبدالعزیز اور سید احمد شہید کے صحبت یافتہ تھے)، مولانا محمد مظہر نانوتوی، مولانا احمد علی محدث سہارنپوری، مولانا محمد قاسم نانوتوی اور مولانا محمد یعقوب نانوتوی شامل ہیں۔

مطبع مجتبائی، دہلی اور میرٹھ کا اشاعت قرآن مجید میں بڑا حصہ: ہندوستان میں کتابت واشاعتِ قرآن مجید میں، برصغیر ہند کے بہت ممتاز خطاط، مطبع مجتبائی اور ہاشمی کے مالک و مؤسس، منشی ممتاز علی کی بھی غیر معمولی خدمات ہیں۔ منشی صاحب نے قرآن کریم کی کتابت وصحت اور قرآن کریم کے اردو و فارسی ترجمے اور عربی متعلقات کی اشاعت کا، بہت بڑے پیمانہ پر انتظام وانصرام کیا تھا۔ منشی ممتاز علی اور اس وقت کے مطبع مجتبائی سے شائع قرآن مجید کی بارہ، تیرہ اشاعتیں میری نظر سے گذری ہیں۔ خیال یہ ہے کہ مطبع مجتبائی میرٹھ کی، قرآن مجید کی کل اشاعتیں اٹھارہ یا بیس ہوں گی۔ ان اشاعتوں میں نئے نئے طریقوں سے آرائش وزیبائش کی گئی ہے۔ کتابت کا تنوع، علیحدہ علیحدہ انداز، چھوٹی بڑی طباعتوں کا اہتمام، ترجمے اور بلا ترجمے ہر طرح کی، طباعتوں کی مسلسل کوشش اور بڑے علماء سے ان کی تصحیح و نظر ثانی کا انتظام، مطبع مجتبائی کا خاص حصہ ہے۔

مطبع مجتبائی میں، علمی کاموں اور تصحیح کتب کی خدمت کے لئے، کئی جید علماء اور بڑے مجود و حفاظ، ہمیشہ رہتے تھے، جس میں مولانا سبحان بخش شکارپوری (شاگرد حضرت شاہ محمد اسحاق) مولانا محمد قاسم نانوتوی، مولانا محمد یعقوب نانوتوی، مولانا ملا محمود دیوبندی (شاگرد شاہ عبدالغنی واول مدرس، دیوبند) اور اس طرح کے دسیوں اصحاب تھے، جو ان طباعتوں کی تصحیح اور نگرانی پر مامور تھے۔ مطبع مجتبائی کے شائع کئے ہوئے قرآن مجید کے اردو ترجموں کا تعارف، ایک مفصل مضمون کا طالب ہے۔

مولانا محمد قاسم کی تصحیح سے شائع ایک قرآن مجید اور ایک حمائل: یہاں صرف مطبع مجتبائی کی دو اشاعتوں کا تذکرہ کیا جاتا ہے، جو دونوں مولانا محمد قاسم نانوتوی کی تصحیح سے شائع ہوئیں تھیں۔ ان میں ایک بڑا قرآن مجید ہے اور ایک حمائل شریف۔ مولانا نانوتوی کی تصحیح سے مزین اور مطبع مجتبائی سے شائع ہونے والے قرآن شریف کا کہیں کہیں ذکر آجاتا ہے، لیکن حضرت مولانا کی تصحیح سے جو حمائل شریف چھپی تھی، اس کا تذکرہ نہیں کیا جاتا۔

مولانا محمد قاسم کی تصحیح سے مزین یہ قرآن مجید ۱۲۸۱ھ (۱۸۶۴-۶۵ء) میں مطبع مجتبائی سے چھپا تھا۔ اس کے سرورق پر لکھا ہوا ہے ''بعد تصحیح تام وبذل جہد تمام، مولوی حافظ محمد قاسم صاحب نانوتوی''۔

یہ قرآن مجید حسن کتابت اور صحت متن کا ایک نمونہ ہے۔ اس کی کتابت سے آنکھیں روشن ہوتی ہیں۔ اس کی ترتیب وطباعت میں مولانا احمد علی محدث سہارنپوری اور مطبع نظامی کانپور سے شائع شدہ قرآن مجید کو اساس بنایا گیا ہے۔ مولانا محدث سہارنپوری اور مطبع نظامی کی ترتیبات کے مطابق، حاشیہ پر رسم عثمانی اور ہر سورہ کے حروف وکلمات، آیات ورکوعات کی وضاحت اور کہیں کہیں تفسیر بحر العلوم

(علامہ غلام مصطفی تھانیسری) کے حوالے سے منتخب اور اہم وضاحتیں درج ہیں۔

یہ قرآن مجید بڑی پیمائش کے، چھ سو تین (۶۰۳) صفحات پر مشتمل ہے۔ آخری سے پہلے صفحے پر، منشی ممتاز علی مالک مطبع کے قلم سے اختتام طباعت درج ہے۔ آخری صفحے پر قطعات تاریخ ہیں، جس میں سے منظوم دو تاریخیں مولانا محمد قاسم صاحب کی کہی ہوئی ہیں۔ پہلے قطعے میں پانچ اور دوسرے میں چار شعر ہیں۔ اس طباعت کا تقریباً بیس سال پہلے، ایک عکس پاکستان سے چھپا تھا۔ ضرورت ہے کہ اس کو دوبارہ بڑے پیمانہ پر شائع کیا جائے۔

حمائل شریف تصحیح مولانا محمد قاسم نانوتوی: منشی ممتاز علی صاحب نے، مطبع مجتبائی سے، مولانا محمد قاسم کی تصحیح سے ایک حمائل شریف بھی شائع کی تھی، جس کا چودہ سطری مِسطر ہے۔ اس کی کتابت، آرائش، حاشیے کی بیلیں، ایسی خوبصورت اور دیدہ زیب ہیں کہ اس کے دیکھنے سے آنکھیں روشن ہوتی ہیں۔ ترقیات کے اس دور میں بھی ایسی طباعت آسان نہیں ہے۔

یہ حمائل شریف سات سو سینتیس (۷۳۷) صفحات پر پوری ہوئی ہے۔ اس کے بعد آخری دو صفحات (۷۳۸-۷۳۹) پر، مولانا محمد قاسم کے قلم سے فارسی میں تقریظ اور دو قطعات تاریخ درج ہیں۔ پہلا قطعہ تاریخ فارسی میں ہے، دوسرا اردو میں۔ بالکل آخری صفحے پر قرآن کریم کے فضائل درج ہیں۔ اس پر اگرچہ عرض مرتب کا عنوان نہیں، مگر بظاہر یہ مولانا قاسم کی تحریر ہے۔ اس حمائل شریف کے سرورق پر یہ الفاظ چھپے ہیں:

مادۂ تاریخ مطبع مصحح مطبع مولوی محمد قاسم صاحب سلمہ مالا مثل لہ ولا مثال

۱۲۸۶ھ

محمد ممتاز علی

۱۲۸۳ھ

مطبع مجتبائی سے جو طرح طرح کے قرآن شریف چھپے، ان میں سے ایک وہ ہے جو ۱۲۸۵ھ (۶۹-۱۸۶۸ء) میں شائع ہوا تھا۔ یہ قرآن شریف بھی بڑی پیمائش کا ہے اور چار سو اٹھاسی (۴۸۸) صفحات پر مشتمل ہے۔ ہمارے یہاں موجود، اس طباعت کا ایک نسخہ کئی وجوہ سے نہایت اہم، یادگار اور تاریخی نسخہ ہے۔ اس نسخے میں قاری عبدالرحمن انصاری محدث پانی پتی (شاگرد حضرت شاہ محمد اسحاق) نے، مولانا گل حسن صاحب کو قرأت سبعہ کا درس دیا تھا، اور تمام قرأآت اپنے مبارک قلم سے، اس قرآن شریف پر تحریر کی تھیں۔ اس کے متن اور حواشی دونوں، حضرت قاری عبدالرحمن کی تحریرات وافادات سے

لبریز ہیں۔ سورۂ احزاب میں، ص: ۳۴۱ کے حاشیے پر، حضرت قاری صاحب نے تحریر فرمایا ہے: " از اول فاتحہ تا قولہ تعالیٰ لطیفاً خبیراً حضرت قرآن مجید را ، بقرأت سبعہ مکررہ متواترہ بقاعدہ جمع الجمع از مولوی گل حسن۔۔۔۔ شنیدم۔ فقط کتبہ العبد المذنب عبدالرحمن"

اس پورے قرآن مجید میں تمام آیتوں پر سرخ روشنائی سے آیات کا شمار بھی رقم کیا گیا ہے، جو غالباً، حضرت قاری عبدالرحمن کے مبارک قلم سے ہے۔ اور اسی کے آخری صفحے سے پہلے (۴۸۷) پر، حضرت قاری عبدالرحمن کے شاگرد، مولانا گل حسن صاحب پانی پتی نے لکھا ہے:

بفضلہ تعالیٰ ترقیم سبعہ قرأت، بروز جمعہ بوقت آواز اذان جمعہ، بتاریخ ۱۶ ماہ ربیع الثانی ۱۲۹۰ھ در پانی پت، از دست گل حسن باتمام گرفتہ بمنہ [و] کرمہ۔ وہفت پارہ در سبعہ قرأت، از مولانا مولوی قاری عبدالرحمن صاحب انصاری پانی پتی تا ایں۔۔۔ در آوردہ۔ الٰہی بانجام رسائی۔ بحرمۃ النبی وآلہ الامجاد۔

اس قرآن شریف کے آخری صفحے (۴۸۸) پر ایک اور یادگار تحریر، پانی پت کے ممتاز قاری، قاری محمد اسماعیل صاحب کے قلم سے درج ہے، قاری صاحب نے لکھا ہے: "مملوکہ خاک پائے محمد، اسماعیل ۱۳۲۳ھ رجب ۱۳۴۲ھ ذی الحجہ، حنفی الفانی فتی عفااللہ عنہ"۔

اس تحریر سے معلوم ہو رہا ہے کہ یہ قرآن کریم، تقریباً بیس سال تک قاری اسماعیل صاحب کی ملکیت و استفادے میں رہا ہے۔

موضح قرآن مجید بتصحیح مولانا محمد قاسم نانوتوی: مطبع مجتبائی نے مولانا محمد قاسم نانوتوی کی تصحیح سے حضرت شاہ عبدالقادر کا ترجمہ موضح قرآن بھی شائع کیا تھا۔ یہ اشاعت موضح قرآن کی غالباً صحیح ترین اور بے نظیر اشاعت ہو گی۔ یہ بھی اپنے آپ میں ایک بڑا یادگار کارنامہ ہے۔ اس اشاعت کا ایک نسخہ میری نظر سے گذرا ہے اور اس کا عکس، میرے ذخیرے میں بفضلہ تعالیٰ موجود ہے۔

مطبع مجتبائی کی چند اور قرآنی خدمات: مطبع مجتبائی میرٹھ کا طباعتی کام، مجتبائی دہلی سے بہت بہتر اور تیز رفتار تھا۔ مطبع مجتبائی میرٹھ نے جو قرآن مجید کے ترجمے شائع کئے، ان میں سے ایک قرآن شریف مولانا سبحان بخش شکارپوری کی تصحیح سے اور کم سے کم ایک قرآن شریف مولانا محمد یعقوب نانوتوی کی تصحیح سے شائع ہوا تھا۔

مطبع مجتبائی نے قرآن کریم کے ترجموں، تفسیروں پر بھی بہت توجہ رکھی۔ اس مطبع نے ترجمے کے ساتھ بھی کم سے کم، دس چھوٹے بڑے قرآن مجید شائع کئے تھے۔ حضرت شاہ عبدالقادر کا ترجمہ، شاہ رفیع الدین سے منسوب ترجمہ، حضرت شاہ ولی اللہ کا فارسی ترجمہ، علامہ شریف جرجانی کا فارسی ترجمہ

اور بعض اردو، فارسی ترجمے، اعلیٰ معیار پر آب وتاب سے چھاپے تھے۔

مطبع مجتبائی نے تفسیر جلالین کے بھی کئی عمدہ نسخے شائع کئے تھے، جن میں ایک طباعت، اردو ترجمہ کے ساتھ، ایک اور طباعت، اردو فارسی کے دو ترجموں کے ساتھ تھی۔ اس مطبع کی اور بھی اعلیٰ درجے کی قرآنی خدمات ہیں، جس کے تعارف کے لئے ایک مفصل مقالہ کی ضرورت ہے۔

حضرت قاری عبدالرحمن پانی پتی کی تصحیح سے شائع قرآن مجید: قرآن کریم کی طباعتوں میں سے ایک اہم قرآن شریف وہ ہے، جو ہندوستان کے ممتاز ترین قاری، محدث اور فقیہ، قاری عبدالرحمن پانی پتی نے اپنی تصحیح اور سبعہ قراآت کے اہتمام سے ۱۳۱۳ھ میں مطبع فیض عام، مظفر نگر سے شائع کرایا تھا۔ اس قرآن شریف میں بین السطور قرأت کی علامات اور حاشیوں پر قرائے سبعہ کی تصریحات اور اعراب وکلمات کی تحقیق، مرتب اور شائع کی گئی ہے۔ یہ قرآن شریف بھی صحت وطباعت کے لحاظ سے بے نظیر ہے۔ اس کے آخر میں حضرت قاری صاحب کا ایک اختتامیہ فارسی میں، بعض قراآت کی توضیح اور حضرت قاری صاحب کی قرآن مجید کی مفصل سند درج ہے۔ یہ کل آٹھ صفحات ہیں، جن میں سے ہر ایک صفحہ کا ایک اندراج اس فن کے شائقین وطالبین کے لئے ایک تحفہ اور یادگار ہے۔

قرآن کریم بتصحیح علمائے دیوبند: قرآن کریم کی طباعتوں کے سلسلے میں ایک قرآن شریف کو اور شامل کیا جانا چاہئے۔ یہ قرآن شریف مطبع قاسمی دیوبند سے چھپا تھا۔ اس وقت کے ممتاز مدرسین وعلمائے دیوبند نے فرداً، فرداً اس کی تصحیح فرمائی تھی، جو یہ تھے:

مولانا مفتی عزیزالرحمن عثمانی (صدر مفتی دارالعلوم دیوبند)، مولانا سراج احمد رشیدی (شاگرد وخادم خاص، مولانا رشید احمد گنگوہی، مدرس دارالعلوم دیوبند)، مولانا قاری عبداللہ الہ آبادی (نامور قاری اور استادالقراء)، مولانا اعزاز علی امروہوی (استاد ادب وفقہ دارالعلوم دیوبند)

یہ قرآن شریف ۱۳۴۲ھ (۱۹۲۳-۲۴ء) میں مطبع قاسمی، دیوبند سے شائع ہوا تھا اور چھ سو چار (۶۰۴) صفحات پر مشتمل ہے۔

یہ قرآن مجید کی ابتدائی اور چند اہم طباعتوں کا اجمالی تذکرہ تھا۔ مگر یہ مضمون بہت عزیز ولطیف ہے۔ ہندوستان میں طرح طرح کے بے شمار قرآن مجید شائع کئے گئے۔ ان میں سے متعدد امتیازی مقام رکھتے ہیں اور اپنی خصوصیات میں منفرد ہیں، ان سب پر تفصیلی حوالہ لکھنے کی ضرورت ہے۔ حق تعالیٰ شانہ نے توفیق عطا فرمائی تو اس پر لکھنے کا ارادہ ہے۔ واللہ ولی التوفیق۔

ابن حزم اندلسی کا فلسفۂ اخلاق

ڈاکٹر وارث مظہری

اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اسلامک اسٹڈیز، جامعہ ہمدرد، نئی دہلی

wmmazhari@jamiahamdard.ac.in

اخلاق کا موضوع فلسفہ اور مذہب دونوں کے بنیادی مباحث کی حیثیت سے اسلامی اور غیر اسلامی دونوں روایتوں میں شامل رہا ہے۔ فلاسفہ یونان میں سے ارسطو نے خاص طور پر اس پر خامہ فرسائی کی ہے۔ علم الاخلاق میں اس کی کتاب *Nicomachean Ethics* نے اخلاق کی فلسفیانہ بحثوں کو پروان چڑھانے میں اہم کردار ادا کیا۔ عربی میں تیسری صدی ہجری میں اس کا ترجمہ کیا گیا اور ابن رشد اور دیگر مسلم اصحاب علم نے اس کی شروحات لکھیں، جن کی بنیاد پر اسلامی فلسفے میں اخلاق کی بحثیں آگے بڑھیں۔ ابن مسکویہ کی کتاب ''تہذیب الاخلاق و تطہیر الاعراق'' یونانی اور اسلامی فلسفے کے امتزاج پر مشتمل ہے۔ اخلاق کے موضوع پر مسلم مفکرین نے نسبتاً کم لکھا ہے تاہم ابن مسکویہ (م: ۱۰۳۰) سے لے کر شاہ ولی اللہ دہلوی (م: ۱۷۶۲) تک اسلامی فکری روایت میں اس موضوع پر لکھنے والوں کا سلسلہ چلا آتا ہے۔

مسلم علمائے اخلاق نے فلاسفۂ یونان کے مجرد اخلاقی تصورات کی اسلامی فلسفۂ مابعد الطبیعات کی روشنی میں باز تشکیل کر کے اسے نئے انداز میں پیش کرنے کی کوشش کی۔ اس حوالے سے جن اصحاب علم نے قلم اٹھایا، ان میں ابو محمد ابن حزم اندلسی (م: ۱۰۶۴) شامل ہیں۔ انہوں نے اس موضوع پر ایک رسالہ قلم بند کیا جس کا نام ''الاخلاق والسیر فی مداواۃ النفوس'' ہے۔ ابن حزم کا شمار مسلم اسپین (اندلس) کے ممتاز مفکرین اور اصحاب قلم میں ہوتا ہے۔ ان کی علمی و فکری شخصیت کی متعدد اہم جہات ہیں۔ چناں چہ انہیں مختلف علوم جیسے حدیث، فقہ، تاریخ، ادب، اخلاق اور منطق و فلسفہ میں کمال حاصل تھا۔ ان میں انہوں نے گراں مایہ علمی نقوش چھوڑے ہیں جو اسلامی تراث کا قیمتی اور لازوال حصہ ہیں۔ فقہ میں وہ ظاہری مذہب کے پیروکار تھے اور اس میں ان کی کتاب ''المحلّٰی''، عظیم شہرت رکھتی ہے۔ اصول فقہ میں ''الإحکام فی اصول الأحکام''، عقائد و کلام میں ''الفصل فی الملل والأھواء والنحل'' ان کی مشہور کتابیں ہیں۔ ابن حزم کی ذہانت و عبقریت ہر اس موضوع پر سامنے آتی ہے جس

پر انہوں نے قلم اٹھایا ہے۔ علم الاخلاق کے موضوع پر بھی انہوں نے تفصیل اور جامعیت کے ساتھ اظہار خیال کیا ہے۔ اس مقالے کا مقصد ابن حزم کے اخلاقی نظریات کی تفہیم اور اس کی قدر پیمائی ہے۔

"الاخلاق والسیر" کے مقدمے میں ابن حزم نے لکھا ہے کہ انہوں نے اس کتاب کے اندر اپنی پوری زندگی کے غور و فکر اور تجربات کا نچوڑ پیش کر دیا ہے۔[1] چناں چہ ابن حزم کے فلسفۂ اخلاق کی ایک اہم اساس خود ان کے اپنے ذاتی تجربات و مشاہدات ہیں جن کی بنیاد پر انہوں نے اپنی بعض ذاتی خوبیوں کا ذکر کیا ہے لیکن اس کے مقابلے میں تفصیل کے ساتھ اپنی نفسیاتی و اخلاقی کمزوریوں کا انکشاف و اعتراف کرتے ہوئے اس پہلو پر روشنی ڈالی ہے کہ کس طرح انہوں نے اپنی ان اخلاقی کمزوریوں کی اصلاح کی۔ علمائے اخلاق کی نگاہ میں خود اپنے عیوب کا اعتراف ایک بڑی اخلاقی فضیلت ہے۔ ان کی نگاہ میں فکری غلطی تو قابل معافی ہے لیکن اخلاقی خطا قابل معافی نہیں ہے۔ مثال کے طور پر ابن حزم لکھتے ہیں کہ ان کے اندر غصے، حد سے زیادہ ہنسی مذاق، خود پسندی، بغض اور دوسروں کے ساتھ بد گمانی کا مزاج پایا جاتا تھا لیکن وہ اپنے مزاج و اخلاق کی اصلاح میں کامیاب ہو گئے۔[2] وہ اس پر تفصیل کے ساتھ روشنی ڈالتے ہیں کہ اپنے مزاج و اخلاق کی کس طرح تشکیل اور اس کا تزکیہ کیا جائے؟[3]

اخلاق کی غایت اور اس کی تربیت کا طریقۂ کار

فلاسفہ کے مختلف گروہوں کے نزدیک اخلاق کی مختلف غرض و غایت رہی ہے۔ سوفسطائیوں کے نزدیک اس کی غرض انفرادی سطح پر ذاتی لذت کا حصول ہے۔ جب کہ سقراط کے نزدیک اس کی غرض سعادت[4] ہے جو معرفت کا ثمرہ اور نتیجہ ہوتی ہے۔ اس طرح گویا صاحب اخلاق ہونے کے لیے

---

[1] ابن حزم، (تخریج و تعلیق: طارق بن عبدالواحد بن علی) الاخلاق والسیر فی مداواۃ النفوس، الدمام: دار ابن الجوزی، ۱۴۳۸ھ، ص: ۱۷

[2] ماخذ سابق ص: ۴۴۔۴۶

[3] ماخذ سابق ص: ۱۸۔۲۶

[4] سعادت کے مفہوم کے لیے انگریزی میں happiness کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے۔ قدیم یونانی فلسفیانہ متون میں اس کے لیے Eudaimonia کا لفظ استعمال کیا گیا ہے جو محض خوشی کے بجائے خوش حالی اور انسان کی مجموعی بہبود سے عبارت ہے۔ دیکھیے: https://www.britannica.com/topic/eudaimonia

صاحب علم ومعرفت کا ہونا ضروری ہے۔اس کے بغیر انسان سعادت سے ہم کنار نہیں ہو سکتا۔افلاطون کی نظر میں اخلاق کی غرض وغایت سعادت ہے لیکن وہ عدالت کے نتیجے میں حاصل ہوتی ہے جو تمام امور و معاملات میں اعتدال ووسطیت کی روش اختیار کرنے سے عبارت ہے اور خیر اعلی وسعادت کا حصول اسی صورت میں ممکن ہے جب کہ انسان عالم المثل(The World of Ideas)[۵] کا ادراک حاصل کرلے۔ارسطو کی نظر میں اخلاق کی غرض خیر اعلی کا حصول ہے اور اس کا مفہوم یہ ہے کہ وہ ایسا خیر ہے جس کو بغیر کسی دوسری لالچ کے صرف اسی کے لیے حاصل کیا جائے۔

ابن حزم نے اخلاق کی غایت کی تعیین کے حوالے سے ایک نیا نظریہ وضع کرنے اور ایک منفرد تصور دینے کی کوشش کی ہے۔ان کی نگاہ میں کوئی ایک غرض وغایت جو تمام لوگوں کی نگاہ میں پسندیدہ اور ان کو متحرک رکھنے والی ہو،وہ خود کو غم والم سے بچانا(طرد الھمّ)ہے۔وہ کہتے ہیں کہ کسی بھی فرد یا گروہ انسانی کا جائزہ لیں تو یہی نظر آئے گا کہ اس کا مقصد یہی 'ازالۂ رنج و غم' ہے۔لکھتے ہیں:

تطلبت غرضا یستوی الناس کلہم فی استحسانہ وفی طلبہ فلم أجدہ الا واحدا وھو طرد الھمّ۔۔۔فطرد الھمّ مذھب قد اتفقت الامم کلہا مذ خلق اللہ تعالی العالم الی ان یتناھی عالم الابتداء ویعقبہ عالم الحساب علی الا یعتمدوا بسعیھم شیئا سواہ۔ وکل غرض غیرہ ففی الناس من لایستحسنہ۔

میں نے ایک ایسے مقصد کو تلاش کرنے کی کوشش کی، جس کو تمام لوگ بہتر سمجھتے ہوں اور اس کے حصول کے خواہاں ہوں تو مجھے جو واحد چیز نظر آئی وہ غم کو بھگانا ہے۔۔۔چناں چہ غم سے نجات کے حصول کا مقصد ہی وہ مقصد ہے کہ ابتدائے عالم سے انتہائے عالم و یوم جزا تک تمام

---

[۵] یہ ایک افلاطونی تصور ہے جس کے مطابق یہ طبیعاتی اور مادی دنیا اپنے آپ میں کامل اور حقیقی نہیں بلکہ ناقص اور غیر حقیقی ہے کیوں کہ یہاں کی ہر چیز زمان ومکان میں مقید اور تغیر پذیر ہے۔اسلامی فکری روایت میں اس تصور کی شروعات،ڈاکٹر فضل الرحمن کے بقول،شہاب الدین سہروردی(مقتول:۱۱۹۱)سے ہوئی۔ابن عربی نے اسے پروان چڑھایا اور شاہ ولی اللہ نے اسے مزید وسعت کے ساتھ استعمال کیا۔دیکھیے:
Fazlur Rahman : Revival and Reform in Islam, ed. Ebrahim Moosa, Noida: One World Publications, 2006, p,175۔اسلامی روایت میں پایا جانے والا یہ تصور افلاطونی تصور سے ایک حد تک مشابہ لیکن اپنی تفصیلی خد وخال میں بہت مختلف ہے۔شاہ ولی اللہ کے نقطۂ نظر کے مطالعے کے لیے دیکھیے،حجۃ اللہ البالغہ (تحقیق وتعلیق سعید احمد پالن پوری)الباب الثانی،ذکر عالم المثال، دیوبند: مکتبہ حجاز، ۲۰۱۰،۲،م۷۰-۷۵۔

قوموں کا اس پر اتفاق ہو چکا ہے کہ ان کی تمام تر کوششوں کا ماحصل یہی ہے۔اس مقصد کے علاوہ دیگر مقاصد کے تعلق سے ایسے لوگ مل جائیں گے جو ان کو بہتر تصور نہ کرتے ہوں۔[۶]

اس طرح ابنِ حزم غم سے نجات کے حصول کو سعادت کا ماحصل تصور کرتے ہیں، جس کو اخلاق کی غرض وغایت کے طور پر یونانی فلسفیوں کے یہاں مقبولیت حاصل رہی ہے۔ان کی نظر میں جاہل وعالم، صالح وبد، تمام کا مقصد یہی ہے اور اس کا طریقہ خدا کی رضا کے حصول کی کوشش ہے۔ابن حزم نے اس سعادت کو 'سکینہ' سے تعبیر کیا ہے جو قرآن سے ماخوذ ہے (الفتح:۴)۔اس طرح انھوں نے فلاسفۂ یونان کے اخلاقی تصورات کو کئی جہتوں سے اسلامی رنگ وروح دینے کی کوشش کی ہے۔

ابن حزم کی نظر میں اخلاق انسان کی ایسی عادت یا صفت کا نام نہیں ہے جس میں کوئی تبدیلی پیدا نہ ہوتی ہو جیسا کہ بعض یونانی فلاسفہ کا خیال رہا ہے، بلکہ غزالی اور دوسرے مفکرین اور علمائے اخلاق کی طرح ان کی نظر میں مختلف عوامل کی بنیاد پر اس میں کمی بیشی ہوتی رہتی ہے۔بچوں کی اخلاقی تربیت میں سب سے اہم کردار ماحول کا ہوتا ہے۔ نفس کی اصلاح مشکل ترین کام ہے جس کے لیے مستقل اور مسلسل جدوجہد کرنی پڑتی ہے۔اکثر لوگ اس خوش فہمی میں مبتلا ہوتے ہیں کہ نفس ان کے کنٹرول میں ہے لیکن یہ محض ان کی خام خیالی ہے۔ حقیقت اس کے برعکس یہ ہے کہ وہ نفس کے کنٹرول میں ہوتے ہیں۔ نفس کو کنٹرول میں کرنا بجائے خود مشق ومہارت چاہتا ہے۔اس کے لیے مختلف سطحوں پر ریاضتیں کرنی پڑتی ہیں۔ابن حزم لکھتے ہیں:

> اعلم ان رياضة الانفس أصعب من رياضة الأسد لأن الأسد اذا سجنت فی البيوت التی تتخذها الملوک، أمن شرها والنفس وان سجنت لم يومن شرها۔
>
> جاننا چاہئے کہ نفس کی تربیت اور اس کو سدھا کر اپنے قابو میں کر لینا شیر کو سدھانے سے زیادہ مشکل ہے۔اس کی وجہ یہ ہے کہ اگر شیر کو ان گھروں میں قید کر دیا جائے جو حکمراں اس مقصد کے لیے بناتے ہیں تو اس کے شر سے حفاظت ہو جاتی ہے۔ لیکن نفس کو خواہ کسی طرح قید کیوں نہ کر دیا جائے اس کے شر سے حفاظت نہیں ہو پاتی۔[۷]

وہ کہتے ہیں کہ نفس میں مختلف النوع قوتیں پائی جاتی ہیں جن میں سے قوت غضب وشہوت انسان کو فضائل کے حصول سے روکتی ہے اور یہ قوت تمام قوی عاقلہ پر بسا اوقات حاوی ہو جاتی ہے۔ قوت

---

[۶] الاخلاق والسير ، ص،۱۹

[۷] ماخذ سابق، ص: ۹۲-۹۳

جہل ایسی قوت ہے جو خیر کے طریقوں کو ایک دوسرے کے مشابہ بنا دیتی ہے جس کے نتیجے میں نفس حیرت و تردد کا شکار ہو جاتا ہے اور حصول حق کی راہ اس کے لئے دشوار ہو جاتی ہے۔[۸] ان دونوں کے مقابلے میں قوت عدل ایسی چیز ہے جو نفس کی مختلف قوتوں کے درمیان اعتدال پیدا کرتی ہے اور اسے راہ حق سے قریب کرتی ہے۔ قوت فہم، عقل کو حقائق امور کی معرفت تک رسائی کے لیے راہ کو ہموار کرتی ہے۔[۹] انہوں نے ان قوتوں پر فضائل و رذائل کی بحث میں ایک دوسرے زاویے سے بحث کی ہے۔

علمائے اخلاق نے اخلاق کے موضوع پر جن چیزوں سے بحث کی ہے، ان میں اخلاقی تربیت کے وسائل سر فہرست ہیں۔ غزالی کی نظر میں خود کو اخلاق جمیلہ کا پابند بنانے کے لیے انسان کے لیے ضروری ہے کہ وہ ابتدا میں اپنے نفس کو بتکلف اس پر مائل کرنے اور اعلیٰ اخلاق کے حاملین کی پیروی کی کوشش کرے اور مسلسل ایسا کرتا رہے۔ آگے چل کر یہی چیز اس کے مزاج کا حصہ بن جائے گی۔ بالکل اسی طرح جیسے ایک خطاط یا فقیہ کو خطاطی یا فقہ میں مہارت کے حصول کے لیے ماہر خطاط یا فقیہ کے طرز پر مشق کرنی پڑتی ہے۔[۱۰] ابنِ حزم نے نسبتاً زیادہ اختصار و انضباط کے ساتھ اس مسئلے پر اپنے نظریے کو واضح کرنے کی کوشش کی ہے۔ ان کی نظر میں اخلاقی تربیت کے وسائل بنیادی طور پر چار ہیں:

۱۔ تعلیم ۲۔ کسی نمونے یا اسوے کی پیروی ۳۔ رغبت یا خوف دلانے کا عمل ۴۔ ضمیر۔[۱۱]

ان چاروں وسائل میں سب سے اہم وسیلہ تعلیم ہے۔ وہ انسان کو فضائل کی راہ دکھاتی اور رذائل سے اس کے دل میں نفرت پیدا کرتی ہے۔ کسی عملی اور اخلاقی نمونے کی پیروی (الاقتداء بالنموذج) دانستہ یا نادانستہ طور پر انسان کے دل میں جگہ بناتی چلی جاتی ہے۔ اس تعلق سے وہ گھر میں اپنے والدین کی اور تعلیم گاہوں میں اپنے اساتذہ کے اخلاق و صفات کی پیروی کرتا ہے یا اسی طرح اپنے ساتھیوں اور دوستوں

---

[۸] ابن حزم، الاحکام فی اصول الاحکام، بیروت: دار ابن حزم، ۱، ۲۰۱۶/۲ ۳۲۔۳۳

[۹] ماخذ سابق

[۱۰] ابو حامد الغزالی: احیاء علوم الدین، مکتبہ مطبعہ کریاتہ فوترا، سماروغ، انڈونیشیا، ب۔ت۔، ۱/۶۵

[۱۱] حامد احمد الدباس ، فلسفة الحب والاخلاق عند ابن حزم، عمان، الاردن، دار الابداع والنشر والتوزیع ، ۱۹۹۳، ص: ۱۴۸۔۱۵۲

کی پیروی کرتا ہے۔ لیکن سب سے اہم ماڈل رسول اللہ ﷺ کی ذات ہے۔[۱۲] آپ ﷺ کا نمونہ سب سے کامل نمونہ ہے۔ ترغیب وترہیب کے عمل سے بھی انسان کے اخلاق کو بہتر بنانے میں مدد ملتی ہے، چناں چہ جنت و جہنم اور ثواب و عذاب کے تصور کے ذریعے لوگوں کو تلقین و نصیحت کی کوشش انسان کو رذائل سے دور رکھنے میں اہم کردار ادا کرتی ہے۔ چوتھی چیز ضمیر ہے اور اسلام میں اسی کو تقویٰ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ جو انسان کے دل کی بیداری کی کیفیت کا نام ہے اور اس بیداری کی اولین علامت یہ ہوتی ہے کہ انسان اپنی خطا کا فوراً اعتراف کرلے اور اس پر ندامت کا اظہار کرے۔ اور خدا کی موجودگی اور نگرانی کا اس کے اندر ہمہ دم احساس ہو۔ ابن حزم کے تصور اخلاق کے مطالعے سے مجموعی طور پر اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی نگاہ میں اخلاقی تربیت کے دو اہم اور بنیادی مقاصد ہیں: اعلیٰ اخلاقی و انسانی صفات کا حصول اور آخرت کی کامیابی۔

اخلاق کی نظریاتی بحث میں خیر وشر کا پہلو مرکزی حیثیت رکھتا ہے۔ ابن حزم کہتے ہیں کہ دنیا کی کوئی بھی چیز اپنی ذات میں نہ مطلقاً خیر ہے اور نہ مطلقاً شر۔ خیر پر مبنی اور اچھی چیز (حسن) وہ ہے جس کو اللہ تعالیٰ خیر قرار دے اور بری (قبیح) وہ ہے جس کو اللہ کا ہی کوئی حکم برا قرار دے۔ اس طرح اس مسئلے میں وہ اشاعرہ کے ساتھ نظر آتے ہیں۔[۱۳] اگرچہ مختلف دوسرے مسائل میں وہ شدید طور پر اشاعرہ کی مخالفت کرتے نظر آتے ہیں۔

فضائل ورذائل

فضیلت کے بارے میں ابنِ حزم کا نقطۂ نظر ارسطو کے مشابہ ہے کہ وہ افراط و تفریط کے درمیان ایک ایسی صفت اور عادت کا نام ہے جو انسان کے اندر کسی یا بعض کاموں کو بار بار کرتے رہنے سے حاصل ہوتی ہے۔ یہ قوت، عقل کے قوتِ شہوت و غضب پر غالب آجانے سے حاصل ہوتی ہے۔ انسان کے اندر قوتِ عقل اور قوتِ شہوت کے درمیان ایک کشمکش کی کیفیت پائی جاتی ہے۔ جب انسان پر عقل کا غلبہ ہوتا ہے تو اس کے اندر زہد اور دنیا سے گوشہ نشینی کی کیفیت پیدا ہوتی ہے اور جب شہوت عقل پر غالب آجاتی ہے تو انسان تمام تر فطری اقدار و اخلاق سے عاری ہوجاتا ہے۔ ابنِ حزم کے نزدیک شہوت فی نفسہ

---

[۱۲] الاخلاق والسیر، ص:۸۱

[۱۳] الاحکام فی اصول الاحکام، بیروت: دار ابن حزم، ۱/۱۰۳

شر نہیں ہے، بلکہ اس میں شر کا پہلو اس وقت پیدا ہوتا ہے جب وہ عقل پر غالب آجائے۔[۱۴] ان کے نزدیک بنیادی فضائل چار ہیں:[۱۵] ۱۔ عدل ۲۔ فہم ۳۔ شجاعت اور ۴۔ سخاوت۔

عدل: کسی بندے پر اللہ کا یہ بہت بڑا انعام ہے کہ اس کے اندر عدل اور اس سے محبت کا اور حق اور اس کے ایثار کا جذبہ ہو، جس شخص کے اندر عدل کی صفت نہیں پائی جاتی اس کی اصلاح انتہائی مشکل ہے:

العدل حصن یلجأ الیه کل خائف وذلک انک تری الظالم وغیرالظالم اذا رأی من یرید ظلمه دعا الی العدل وانکر الظلم حینئذ وذمه۔ ولا تری احدا ان یذم العدل فمن کان العدل فی طلبه فهو ساکن فی ذلک الحصن الحصین۔

عدل وانصاف ایک ایسا قلعہ ہے جس میں ہر خوف زدہ اپنی پناہ تلاش کرتا ہے۔ چناں چہ آپ دیکھیں گے کہ جب کوئی ظالم یا غیر ظالم کسی کو اپنے اوپر ظلم کا ارادہ کرتا ہوا دیکھتا ہے تو وہ عدل کی دہائی دیتا ہے۔ اور ظلم کو ناپسند کرتا ہے اور اس کی مذمت کرتا ہے۔ اس کے برعکس آپ کسی کو نہیں دیکھیں گے کہ وہ عدل وانصاف کی مذمت کرتا ہو۔ چنانچہ عدل جس کے مزاج کا حصہ ہوتا ہے تو وہ اس مضبوط قلعے میں آباد ہوتا ہے۔[۱۶]

عدل وہ صفت ہے جس کو مشترکہ طور پر یونانی اور مسلم فلاسفہ وعلمائے اخلاق نے سب سے اہم صفت قرار دیا ہے۔ ابن مسکویہ اور غزالی سے شاہ ولی اللہ تک سبھوں نے اخلاق کی بحث میں اسے فضیلت کے بنیادی ارکان میں شامل کیا ہے۔

فہم: یونانی فلسفے میں علم کو جو فہم کے قبیل کی ہی صفت کا نام ہے، بنیادی فضیلت کا درجہ حاصل ہے۔ جیسا کہ اوپر مذکور ہوا، سقراط کے نزدیک اخلاق کا مقصد سعادت کا حصول ہے جس کا ذریعہ علم ہے۔ ابن حزم کی نگاہ میں فہم ایک بنیادی فضیلت ہے۔ وہ دو طرح کی معرفتوں پر مشتمل ہے: نظری اور عملی۔ نظری یا عقلی معرفت کی فضیلت وصفت آدمی کو چیزوں کے حقائق، نیز پیش آمدہ مشکلات ومسائل سے آگاہ کرتی ہے یا دوسرے لفظوں میں اپنی عقل سے انسان اس کا ادراک کرلیتا ہے، جبکہ معرفت عملی، عقلی سطح پر معرفت کو عملی شکل دینے کا نام ہے۔

شجاعت: ارسطو کے نزدیک قوت غضبیہ میں اعتدال سے شجاعت کی صفت پیدا ہوتی ہے۔ یہی خیال

---

[۱۴] الاخلاق والسیر ص:۸۷

[۱۵] ماخذ سابق ص:۷۶

[۱۶] ماخذ سابق ص۹۸

ابن حزم کا بھی ہے۔ شجاعت کسی اہم مقصد کے لیے قربانی دینے کی صفت کا نام ہے۔ اس مقصد کا تعلق مذہب اور اپنی عزت و آبرو کی حفاظت سے ہو یا پڑوسی کو ظلم سے بچانے اور مدد طلب کرنے والے مظلوموں کو اس کے ظلم سے نجات دینے سے۔ یہ بزدلی اور ناعاقبت اندیشی کے ساتھ کسی کام میں کود پڑنے (تہوّر) کی درمیانی صفت کا نام ہے۔

سخاوت: ابن حزم کے نزدیک سخاوت اپنی ضرورت سے بچے ہوئے مال کو خیر کے مصارف میں خرچ کر دینے کا نام ہے۔ ان مصارف میں سب سے افضل محتاج پڑوسی کی مدد کرنا، غربت سے دوچار اپنے قریبی رشتہ داروں کی مدد کرنا اور عمومی طور پر تمام ضرورت مندوں کے کام آنا شامل ہے۔ اعلیٰ درجے کی سخاوت یہ ہے کہ آدمی اپنی ضرورت کو پس پشت ڈالتے ہوئے بے غرضی کے ساتھ دوسروں کی ضرورت کو پورا کرنے کو ترجیح دے۔

ان بنیادی فضائل کی باہمی ترکیب سے مختلف دوسرے فضائل پیدا ہوتے ہیں۔ چناں چہ عدل و سخاوت کی ترکیب سے عفت و امانت اور قناعت پیدا ہوتی ہے۔ بردباری شجاعت سے پیدا ہوتی ہے۔ صدق عدل و شجاعت سے اور مدارات بردباری اور صبر کے امتزاج سے پیدا ہوتی ہے۔[۱۷] مذکورہ چار فضائل کے برعکس صفات بنیادی رذائل کی حیثیت رکھتی ہیں اور وہ بھی چار ہیں: ظلم (الجور)، جہالت (الجہل)، بزدلی (الجبن) اور بخل (الشح)[۱۸]۔ ان کے علاوہ جو رذائل ہیں ان کی نظر میں انھیں تین قسموں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے: ۱۔ جھوٹ ۲۔ چغل خوری ۳۔ حرص۔

جھوٹ: تین رذائل سے مرکب ہے: ظلم، بزدلی اور جہالت۔ یہ لفظ عام ہے اور حقائق کے ہر طرح کے انکار کا نام ہے۔ جس نے اللہ تعالیٰ کا انکار کیا، وہ بھی جھوٹا ہے، جس نے حقیقت کے برخلاف کسی کو کوئی خبر دی وہ بھی جھوٹا ہے اور جس نے ایسا کام کیا جو غیر ضروری تھا وہ بھی جھوٹا ہے۔ وہ کہتے ہیں جھوٹ سے زیادہ بری کوئی اور چیز نہیں ہے اور کفر اسی کی ایک قسم ہے۔ تاہم جھوٹ کی ان تمام تر قباحتوں کے باوجود نیک اور خیر کے مقصد کے لیے جھوٹ بولنا جائز ہے۔ اور اس کے جائز ہونے کی چار صورتیں ہیں: (۱) بیوی کی اصلاح یا ازدواجی زندگی کو ٹوٹ پھوٹ اور انتشار سے بچانے کے لیے شوہر کا جھوٹ بولنا۔ (۲) کسی ظالم بادشاہ یا حکومت کے ظلم سے کسی مظلوم کو بچانے کے لیے جھوٹ بولنا۔ (۳) جنگ

---

[۱۷] ماخذ سابق ص: ۷۶۔۷۷

[۱۸] ماخذ سابق، ص: ۷۷

میں جھوٹ بولنا کہ اس سے اہلِ شر وبغاوت کا فتنہ ختم ہو۔(۴) اپنی جان کی حفاظت کے لیے اظہار کفر کے طور پر جھوٹ بولنا۔[۱۹]

ان چار بنیادی رذائل سے مختلف دوسری رذائل کی صفات پیدا ہوتی ہیں۔ چنانچہ حرص طمع سے،[۲۰] طمع حسد سے، حسد رغبت، ظلم بخل اور جہل سے پیدا ہوتی ہے۔ پھر اس حرص سے متعدد رذائل انسان کے اندر جنم لیتے ہیں جیسے ذلت، سرقہ، غصب، قتل وغیرہ۔ سب سے بڑی برائی کذب ہے اور کفر بھی اسی کی ایک نوع ہے جو بزدلی اور جہالت سے پیدا ہوتی ہے۔ بزدلی سے بایں معنی کہ وہ ذلت نفس کی خو پیدا کرتی ہے اور کذاب ذلت نفس میں جینے والے ہوتے ہیں۔[۲۱]

مختلف اخلاقی خرابیوں کے تعلق سے ان کے مشاہدات و تجربات فکر انگیز ہیں۔ عجب اور خود پسندی کا مزاج انسان کے اندر کیوں پیدا ہوتا ہے جس کی وجہ سے وہ دوسروں کو حقیر سمجھنے لگتا ہے؟ ابن حزم کی نگاہ میں اس کی وجہ یہ ہے کہ ایسا شخص یہ سمجھتا ہے کہ دوسروں کے مقابلے میں وہ زیادہ عاقل و دانش مند ہے لیکن اسے اپنے کمال عقل و فراست کے اظہار کا موقع نہیں مل سکا ورنہ دوسروں پر اس کی عقل کی دھاک جم جاتی۔ حالاں کہ حقیقت میں ایسے لوگ انتہائی کم عقلی اور احساس کمتری کا شکار ہوتے ہیں۔[۲۲]

اخلاق اور عقل

ابن حزم کے تصورِ اخلاق کا ایک اہم امتیاز یہ ہے کہ وہ عقل کو خصوصی اہمیت دیتے ہیں۔ اور عقلی رویے کے مقابلے میں تقلیدی رویے کو وہ بہت سی خرابیوں کا سرچشمہ تصور کرتے ہیں۔ عقل کو وہ ایک بنیادی فضیلت تصور کرتے ہیں۔ ایسی فضیلت جو تمام دوسری فضیلتوں میں اس لحاظ سے انفرادیت کی حامل ہے کہ اس میں افراط اور زیادتی نقص پیدا نہیں کرتی۔ جب کہ دوسرے فضائل میں افراط کا ہونا نقص کا باعث بنتا ہے:

الفضیلة وسیطة بین الافراط والتفریط فکلا الطرفین مذموم والفضیلة وسیطة بینهما محمودة،حاشا العقل فانه لا افراط فیه

---

[۱۹] ابن حزم،الفصل فی الملل والاهواء والنحل(ج،۳)، قاہرہ،شرکة السحار للطباعة والنشر، ۲۰۱۰، ۳،ص ۱۰۔

[۲۰] ابن حزم نے حرص اور طمع میں فرق کیا ہے۔ ان کے نزدیک حرص نفس کے اندر پوشیدہ طمع کے اظہار کا نام ہے: هواظهارمااستکن فی النفس من الطمع: الاخلاق والسیر، ص:۷۷۔

[۲۱] الاخلاق والسیر، ص:۷۷-۷۸

[۲۲] ماخذ سابق ص: ۹۵-۹۶

(فضیلت (انسان کے خلقی اوصاف) میں پائے جانے والے افراط و تفریط کے درمیان اعتدال کا نام ہے۔ چنانچہ اس فضیلت کی دونوں ہی طرفیں مذموم ہیں اوران کی درمیانی صفت محمود ہے۔سوائے عقل کے کہ اس میں افراط اور زیادتی سے کوئی نقص پیدا نہیں ہوتا)[۲۳]

اس کی مثال مثلاً سخاوت ہے۔ سخاوت فضول خرچی (افراط) اور بخل (تفریط) کی درمیانی صفت کا نام ہے۔ لیکن عقل میں تفریط (کمی) سے توحماقت پیدا ہوتی ہے لیکن افراط سے اس میں کوئی نقص پیدا نہیں ہوتا۔اس سے ابن حزم کا مقصود اس بات کا اظہار ہے کہ عقل جو ایک فضیلت کلی ہے اس کی کوئی انتہا اور حد نہیں ہے جس کی بنا پر یہ فرض کرلیا جائے کہ اس سے متجاوز ہونا اس کے کردار کی اہمیت کو کم کردیتا ہے۔ان کے یہاں روایت ودرایت اور عقل و نقل دونوں پر اعتماد کا خوب صورت امتزاج ملتا ہے۔تاہم اسی کے ساتھ عقل کے حوالے سے ان کا تصور یہ ہے کہ وہ ایسی قوت ہے جو صرف اشیا کے ظاہر کا ادراک اور موجودات حقیقی کی شناخت کرتی ہے:(قوة تميز النفس بها الاشياء على ما هي عليه فقط ويعرف ماصح وجوده)۔[۲۴]

ابن حزم کے نزدیک عقل کی دو جہتیں ہیں: پہلی جہت وہ ہے جس کے ذریعے محسوسات کا ادراک کیا جاتا ہے۔اس ضمن میں انسانی زندگی اور کائنات کے ان تمام احوال وواقعات کا شمار ہوتا ہے جو انسانی عقل اور مشاہدات و تجربات کے دائرے میں آتے ہیں۔انسان اپنی عقل سے ان کے اسباب اور علتوں کو دریافت کرنے اور سمجھنے کی کوشش کرتا ہے۔اسے وہ ''العقل الممیز'' سے موسوم کرتے ہیں یعنی تمیز کرنے والی عقل۔دوسری جہت وہ ہے جس کے ذریعے اشیا کی ماہیت اور غیر محسوس حقائق کا ادراک کیا جاتا ہے، جس میں سب سے پہلے خدا کی ذات آتی ہے۔ پھر رسالت اور خدا کے احکامات اور ان اخلاق و اقدار کی معرفت ہے، جو دین کے توسط سے ہمارے احساسات کا حصہ بنے ہیں۔اسے وہ ''العقل الفاضل'' کا نام دیتے ہیں۔یہ عقل فاضل ہی ہے جو انسان کو اخلاقی شعور عطا کرتی ہے اور ایک انسان کو دوسرے انسان سے ممیز کرتی ہے کیوں کہ عقل ممیز میں تمام انسان مساوی حیثیت رکھتے ہیں۔[۲۵]

ابنِ حزم کے نزدیک اخلاقی اقدار کا سر چشمہ اصلاً دین ہے۔ لیکن عقل کا کردار یہ ہے کہ وہ اس کی

---

[۲۳] ماخذ سابق ص ۱۰۱

[۲۴] الفصل فی الملل والاهواءوالنحل۔ ۱۲۵/۵

[۲۵] الاحکام فی اصول الاحکام ، ۲۸/۵

حکمتوں تک رسائی حاصل کرے۔ کیوں کہ وہ حکمتوں سے خالی نہیں ہو سکتے جیسا کہ اشاعرہ اس کے قائل رہے ہیں۔ عقل کی اس جہت کا تقاضا یہ ہے کہ آدمی دین اوراس کے مطابق صحیح عمل کی شناخت کر سکے تاکہ وہ آخرت کی عظیم کامیابی اورابدی سلامتی سے سر فراز ہو سکے۔انہوں نے تقریباً تمام امور میں عقل کو اپنے اخلاقی تصور میں اساسی اہمیت دینے کی کوشش کی ہے۔ان کی نظر میں رذائل کو اختیار کر لینے کی ایک بڑی بنیاد عقل کو درکنار کر کے تقلید کی روش اختیار کر لینا ہے۔اور تقلید اس کو کہتے ہیں کہ آدمی کسی کی بات کو بغیر کسی برہان (دلیل قطعی) کے قبول کر لے۔ تقلید ان کی نظر میں عقل کے انکار کے مترادف ہے۔

ابن حزم کا منہج فکر اوراس کی خصوصیات: ایک تنقیدی نظر

مندرجہ بالا سطور میں ابن حزم کے اخلاقی تصورات کے مختلف پہلوؤں کا جائزہ لینے کی کوشش کی گئی ہے۔اس سے ابن حزم کے اخلاقی نظریات کے مختلف امتیازی پہلو سامنے آتے ہیں۔ابن حزم نے بھی ابن مسکویہ اور غزالی کی طرح یونانی فلسفے سے استفادہ کیا ہے لیکن مسکویہ کی طرح نہ تو ان کے یہاں اس کا غلبہ نظر آتا ہے اور نہ ہی غزالی کی طرح عرفان و تصوف کے نظری و عملی پہلوؤں کا، جس کی بنا پر غزالی کو تنقید کا نشانہ بنایا گیا۔

ابن حزم تقلید کو ساری خرابیوں کی جڑ تصور کرتے ہیں۔اس بنا پر ان کا معیار فکر دو کلی امور پر مبنی ہے: عقل اور کتاب و سنت سے مستفاد نقل۔ان دونوں کا خوب صورت امتزاج ان کے اخلاقی فلسفے میں نظر آتا ہے۔تاہم انہوں نے اسلامی و فلسفیانہ منہج کو ایک دوسرے سے اس طرح ہم آہنگ کرنے کی کوشش کی ہے کہ اس میں اسلام کے نظریۂ حیات و کائنات کو اولیت حاصل ہے اوراس کا بنیادی فہم صرف عقل کے بجائے وحی سے ہی حاصل ہوتا ہے۔اس طرح یہ نکتہ بھی قابل غور ہے کہ ابن حزم نے اخلاق کے نظری کے بجائے عملی پہلوؤں پر زیادہ ارتکاز کیا ہے جس کی دو جہتیں ہیں: ایک ہم زمانہ افراد کے اخلاق کا استقراء اور دوسرے اپنی خوبیوں اور کمزوریوں کا اقرار و اعتراف۔وہ فقہ میں ظاہری اور کلام میں محدثین کے منہج کے پیروکار ہیں۔اس کا اثر ان کے فلسفۂ اخلاق میں بھی نظر آتا ہے۔وہ ارادۂ انسانی کے شدت کے ساتھ قائل اوراس باب میں اشاعرہ کی فکر کے شدید ناقد نظر آتے ہیں۔اشاعرہ افعال انسانی کا خالق خدا کو تصور کرتے ہیں۔ابن حزم کی نگاہ میں یہ نقطۂ نظر خدا کے شایان شان نہیں ہے۔وہ کہتے ہیں کہ اگر بندوں کے افعال کا خالق خدا ہے تو اس سے یہ لازم آتا ہے کہ جو چیز اس نے پیدا کی ہے،وہ اس سے خفا ہوتا اوراس کو ناپسند کرتا ہے (یغضب مما خلق ویکرہ ماخلق) یعنی وہ خود اس فعل

سے خوش نہیں ہے جس کو اس نے انجام دیا ہے (ولا یرضی مافعل وما دبر)۔ وہ برملا کہتے ہیں: "لوکان اللہ خالقکم وخالق أفعالکم فانتم والجمادات سواء اگر خدا تمہارے ساتھ تمہارے افعال کا بھی خالق ہے تو تمہارے اور جمادات میں کوئی فرق نہیں رہ جاتا"۔[۲۶]

لیکن اسی کے ساتھ یہ بات بھی قابل غور ہے کہ افعال انسانی کا خالق خود انسان کو قرار دیے جانے سے اشاعرہ کے نزدیک جو قباحت لازم آتی ہے، جس کی وجہ سے انہیں "خلق" کے بجائے "کسب" کا نقطۂ نظر اختیار کرنا پڑا، ابن حزم اس سے تعرض نہیں کرتے۔

ابن حزم کے نظریۂ اخلاق کا ایک کمزور پہلو یہ ہے کہ وہ اسلام کے عرفانی پہلو کو، جو ذوق ووجدان سے مرکب ہے، کوئی اہمیت نہیں دیتے۔ مجرد فلسفہ اور نص کی ظاہری تعبیر کو وہ نظریۂ اخلاق کی تشکیل کے لیے کافی تصور کرتے ہیں۔ ابن حزم کے مقابلے میں شاہ ولی اللہ نے ان دونوں پہلوؤں کو زیادہ اعتدال کے ساتھ برتنے کی کوشش کی ہے۔ اسی طرح ابن حزم کے نظریۂ اخلاق کی ایک کمزوری یہ نظر آتی ہے کہ بسا اوقات اخلاق پر ان کی گفتگو واعظانہ رنگ اختیار کرلیتی ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ اس قبیل کے ان کے سبک اور خوب صورت جملے معنی خیزی کے لحاظ سے بہت اہم ہوتے ہیں۔ ایک قابل غور بات یہ بھی ہے کہ اخلاق کے نظری پہلوؤں پر ان کی گفتگو دوسرے مفکرین مثلاً غزالی یا طوسی کی طرح جامع نہیں ہے۔ بہت سے پہلو تشنہ رہ گئے ہیں۔ تاہم محسوس یہ ہوتا ہے کہ انہوں نے قصداً اخلاق کے عملی پہلوؤں پر ہی ارتکاز کیا ہے۔

خلاصہ

ابن حزم کے فلسفۂ اخلاق پر نسبتاً کم لکھا گیا ہے۔ تاہم حقیقت یہ ہے کہ ان کا فلسفۂ اخلاق کئی پہلوؤں سے امتیازی خصوصیت کا حامل ہے۔ انہوں نے عقل اور شریعت کو اس طرح بہم آمیز کرنے کی کوشش کی ہے کہ اس میں تقلیدی رویوں کے لیے کوئی گنجائش نہ ہو۔ اس باب میں وہ نہ حکمائے یونان کے پیروکار ہیں اور نہ علمائے اسلام کے مقلد و متبع۔ انہوں نے فقہ واجتہاد کی طرح اس باب میں بھی اپنی الگ راہ نکالی ہے۔ انفرادیت کے ساتھ ان کے نظریۂ اخلاق میں دینی عملیت کے پہلو زیادہ نمایاں ہیں۔ ضرورت ہے کہ ان کے فلسفۂ اخلاق کو مزید غور وفکر کا موضوع بنایا جائے۔

---

[۲۶] الفصل فی الملل والاھواءوالنحل، ۳/۲۲۔۲۳

کرناٹک، دکن، اردو اور دارالمصنّفین

محمد عمیر الصدیق ندوی

دارالمصنّفین، اعظم گڑھ

کرناٹک کی جغرافیائی سرحدیں آج جو بھی ہوں، واقعہ ہے کہ ہندوستان کی تقسیم قدرتی لحاظ سے شمال وجنوب کی سمتوں کو جانتی ہے، کشمیر سے کنیا کماری یا ہمالیہ سے بحر ہند اس خطۂ ارض کا تعارف یوں ہوا کہ ایک خطہ میدانی دوسرا کوہستانی و بیابانی کہلایا۔

اردو زبان کی ابتدا، ارتقا، حال اور مستقبل کے تعلق سے کرناٹک تک موضوع کو محدود کیا جاسکتا ہے لیکن اس عنوان کے ابتدائی اور ارتقائی مراحل میں کرناٹک سے زیادہ سرزمین جنوب یا دکن کی جغرافی اصطلاح غالباً زیادہ معنی آفریں ہے۔ اور اس کے لیے خود ایک مستند دکنی یعنی نصیرالدین ہاشمی کا قول بطور تائید پیش کیا جاسکتا ہے جنھوں نے اپنی کتاب دکھنی ہندو اور اردو میں لکھا کہ ''ایک زمانہ تک سلطنت آصفیہ کو دکن سے موسوم کیا جاتا تھا لیکن دراصل دکن میں ہندوستان کے جنوب کا بڑا علاقہ شامل ہے۔

نصیرالدین ہاشمی کا نام آیا تو احساس تازہ ہو گیا کہ یہ کیسی شخصیت تھی، نظام دکن نے حیدرآباد کا نام جاوداں کر دیا تو ہاشمی کے قلم نے دکنیات پر اردو تحقیق وادب کو ایک نئی ریاست عطا کر دی، کتابوں کے نام جدا جدا ہیں، جیسے دکن میں اردو، مدراس میں اردو، یورپ میں دکھنی مخطوطات، سلاطین دکن کی ہندوستانی شاعری، حضرت امجد کی شاعری، مکتوبات امجد، خواتین عہد عثمانی، خیالات نسواں، خواتین دکن کی اردو خدمات، دکھنی ہندو اور اردو۔ یہ ساری کتابیں ہمیشہ دکن اور اردو کے ذکر میں نصیرالدین ہاشمی کی تحقیق وجستجو کے لیے عقیدت کا ماحول بناتی رہیں گی۔ ضرورت ہے کہ ہاشمی دکنیات کا از سر نو مطالعہ و تجزیہ کیا جائے۔

دکن اور دارالمصنّفین کے تعلقات کی سب سے بڑی اور سنہری کڑی علامہ شبلی کی ذات گرامی ہے۔ حیدرآباد اور شبلی یہ ایک مستقل موضوع ہے۔ رسالہ معارف ۱۹۱۶ء سے شائع ہونے لگا تو ایک سال بعد یعنی جون ۱۹۱۷ء میں شبلی کے بعد دکن سے تعلق کا پہلا بڑا اظہار معارف نے اس پر مسرت خبر پر تبصرہ کرتے ہوئے کیا کہ:

حیدرآباد میں مشرقی یونیورسٹی کے قیام کے لیے فرمان شاہی جاری ہوگیا۔ اخبارات میں یہ خبر اس طرح گشت کررہی ہے کہ گویا یہ ایک غیر متوقع دولت اور غیر مترقب نعمت ہے، جن لوگو ں کے پاس الندوہ کے پچھلے نمبر ہیں وہ مارچ ۱۹۰۷ء کے پرچہ میں مولانا شبلی مرحوم کا وہ اصلی خواب پڑھ سکتے ہیں جس کی تعبیر ۱۹۱۷ء میں پوری ہوئی........ حیدرآباد میں مشرقی یونیورسٹی کا تخیل سب سے پہلے نواب عمادالملک سابق ناظم تعلیمات کا نتیجہ فکر ہے اور اس کا سبب یہ ہے کہ چوں کہ پنجاب یونیورسٹی نے وہاں سے اپنے مشرقی امتحانات کا سلسلہ منقطع کردیا اس لیے ضرورت ہوئی کہ کسی جدید یونیورسٹی سے اس کو متعلق کیا جائے، اس جدید یونیورسٹی کے قیام و تاسیس و وضع نصاب کے لیے مولانائے مرحوم حیدرآباد تشریف لے گئے اور ایک نصاب ندوہ کے جدید اصول پر وضع کرکے مع ایک مفصل رپورٹ کے کمیٹی کے سامنے پیش کیا۔

شبلی کے بعد دکن سے دارالمصنّفین کے تعلق کی یہ پہلی تحریری گواہی ہے۔ اب یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ دارالمصنّفین علامہ شبلی کے تخیل کا وہ نتیجہ یا ثمرہ ہے جس کو مولانا سید سلیمان ندوی اور ان کے ہم نفسوں نے حقیقت کا روپ دیا، اسی لیے ہم دارالمصنّفین والے سب سے پہلے کسی بھی موضوع پر پہلے سید صاحب کے سرمایہ پر نظر کرتے ہیں۔ یہ سوچ کر کہ ڈھونڈنے والے کو کچھ نہ کچھ مل ہی جاتا ہے۔

اردو کی ابتداء وارتقاء کی حقیقت کو دارالمصنّفین نے جس طرح واضح کیا وہ بھی فکر انگیز اور قابل غور ہے۔ مثلاً یہی ہے کہ زبان اردو کی تاریخ کے متعلق میر امن اور سرسید اور دوسرے پرانے بزرگوں نے جو بیان سنایا تھا وہ اب پارینہ سمجھا جاتا ہے۔ میر امن کا حوالہ ان کے اس قول کی وجہ سے دیا گیا کہ دلی میں مختلف راجاؤں اور بادشاہوں کی آمد و رفت کے باعث کچھ زبانوں نے ہندو مسلمان کی آمیزش پائی۔ تیموری سلاطین کے آنے اور رہنے سے لشکر کا بازار شہر میں داخل ہوا، اس واسطے شہر کا بازار اردو کہلایا۔

دارالمصنّفین نے اردو زبان کی اس تاریخ کو جو میر امن کی زبان سے نکلی، اس کو غلط نہیں ٹھہرایا، لیکن اردو کو لشکر سے جوڑنے کی بجائے یہ کہا گیا کہ حقیقت یہ ہے کہ ہر ممتاز صوبہ کی مقامی بولی میں مسلمانوں کی آمدورفت اور میل جول سے جو تغیرات ہوئے ان سب کا نام اردو رکھ دیا گیا۔ حالاں کہ ان کا نام پنجابی، دکھنی، گجراتی یا گوجری وغیرہ رکھنا چاہیے۔ یہ بھی کہا گیا کہ اکبر کے دور سے ایک متحدہ ہندوستان وجود میں آنے لگا، پورے ملک میں آمدورفت کا نیا سلسلہ شروع ہوا، اس لیے دہلوی ہندی میں سینکڑوں لفظ ہندوستان کے دوسرے صوبوں کی بولیوں سے آکر رفتہ رفتہ رُل مل گئے۔ خصوصاً پنجابی اور دکھنی لفظوں کی آمیزش زیادہ ہوئی۔ دارالمصنّفین کے گل سرسبد، مولانا سید سلیمان ندوی نے ایک جگہ

لکھا ہے کہ ''مجھے احاطہ مدراس کے مختلف شہروں، مدراس، بنگلور، ترچناپلی، آمبور، میسور وغیرہ جانے کا اتفاق ہوا اور ہر جگہ اردو میں تقریریں ہوئیں اور عموماً ہوتی ہی رہتی ہیں۔ بلگام جیسے دور دراز علاقہ میں جو مدراس اور بمبئی کی سرحد ہے، اردو کا رواج کافی ہے'' اسی طرح انہوں نے دکن کی سرزمین کو اردو کے لیے امید گاہ سے تعبیر کیا اور ۱۹۳۷ء میں بنگلور کو اردو کا خاص مرکز قرار دیا۔ اس کے بعد سید صاحب کی یہ عبارت سب کچھ کہہ جاتی ہے کہ:

> اردو کی جائے پیدایش بننے کا فخر خواہ ہندوستان کے کسی گوشہ کو حاصل ہو مگر اس میں کسی شبہہ کی گنجایش نہیں کہ دکن ہی وہ سرزمین ہے جہاں اردو شاعری کا بیج پہلے بویا گیا اور اس نے پودا بن کر نشو و نما حاصل کی۔ شمالی ہند کے رہنے والوں نے جب اس پودے کے پھل پھول اور بو باس کو دیکھا تو بے اختیار اس کی آبیاری کو آمادہ ہوئے اور چند روز کے بعد اس کی قلم اپنی سرزمین میں لگا کر اس کو سدا بہار بنا دیا۔ قائمؔ کے زمانے تک اردو کو دکنی کا طعنہ سننا پڑتا تھا۔
>
> قائم! میں غزل طور کیا ورنہ اک بات لچر سی بزبان دکنی تھی
>
> تاریخ اردو کی نئی تحقیقات نے یہ ثابت کیا ہے کہ اردو نظم نے دلی کے تخت طاؤس کی بجائے دکن کے چتر و مسند کے زیر سایہ نشو و نما پائی۔

مولانا سید سلیمان ندوی کی یہ تحریر بعد میں بحث و مباحثہ کا مرکز بنی یا پھر محققین نے دوسرے دلائل کے انبار لگائے، اس سے قطع نظر یہاں صرف اس نظریہ کی اولیت ظاہر کرنا مقصود ہے جس میں اردو کے پودے کو اپنے سینے سے لگانے والی سرزمین کو دکن سے تعبیر کیا گیا۔ یہ تحریر دراصل ہاشم علی برہانپوری کے ایک مجموعہ مراثی کے تعارف میں تھی، یہاں بطور تمہید پیش کی گئی۔

اصل یہ ہے کہ اردو زبان کی تاریخ سید انشا کے زمانہ سے لے کر آج تک اتنی بار دہرائی گئی کہ وہ اب واقعی داستان پارینہ بن گئی۔ لیکن اس کہانی کا مرکزی خیال ہمیشہ نئے خیالات اور نئے افکار کی آمد کا سبب بھی بنتا رہا ہے۔

دارالمصنفین سے بہت پہلے یہ آواز بلند ہوئی کہ اردو زبان کا پیدا ہونا کسی ایک قوم یا قوت کا نہیں بلکہ مختلف قوموں اور زبانوں کے میل جول کا ایک ناگزیر اور لازمی نتیجہ ہے اور اس کا پیدا ہونا ضرورتاً اور مجبوراً تھا، اردو کو شمال اور جنوب کی سمتوں سے دیکھنے والوں کے لئے یہ خیال آج بھی بڑا فکر انگیز ہے کہ شمالی ہندوستان اگر ہندوستان میں نئی آنے والی قوموں کا شارع عام رہا ہے تو جنوبی ہندوستان یا دکن بعد کو آنے والی قوموں کے لیے شکست کھا کر مجتمع ہونے کے لیے ملجا رہا ہے۔ نئی حملہ آور قوم نے اگر شمالی

ہندوستان سے اپنی پیش رو قوم کو دھکیلا ہے تو دکن ہی کی پہاڑیاں اس کے لیے جائے پناہ بنی ہیں۔ یہی سبب ہے کہ آج جنوبی ہندوستان، قدیم سے قدیم قوموں سے لے کر آخری دور جدید کی قوموں کا تماشا خانہ اور جلوہ گاہ ہے، شمالی ہندوستان میں پشاور سے لے کر مرشد آباد اور ڈھاکہ تک اردو زبان کی عمل داری ہے۔ گو بیچ بیچ میں پشتو، پنجابی اور بنگالی زبانیں بھی آڑے آجاتی ہیں، لیکن یہاں بمبئی اور مدراس کے احاطوں میں ہر سو میل پر ایک مستقل زبان کی حکومت کا رقبہ ہے، گجراتی، مرہٹی، کنڑی، تامل، تیلگو خدا جانے کتنی زبانیں ہیں۔ سید صاحب نے اسی لیے لکھا ہے کہ میں سمجھتا ہوں کہ یہی سبب ہے کہ اردو کی مشترک زبان کی ضرورت سب سے پہلے دکن میں محسوس ہوئی اور ولی دکنی اور سراج دکنی وغیرہ اردو کے شاعر یہاں سب سے پہلے پیدا ہوئے۔ سید صاحب نے ان خیالات کا اظہار ۱۹۱۵ء میں کیا تھا، لیکن جب ان کی یہ تحریر نقوش سلیمانی میں ۱۹۲۷ء میں شامل ہوئی تو اسی جگہ سید صاحب نے یہ نوٹ لگایا کہ دکنی زبان کی نئی تحقیقات نے اس سے بھی صدہا سال پہلے کا کھوج لگایا ہے اور اس بیس بائیس برس کے عرصہ میں دکن کی اردو شاعری کی تاریخ کا سراغ سینکڑوں سال آگے کو بڑھ گیا۔

نقوش سلیمانی کا ذکر آیا تو دارالمصنّفین کی دکن سے عقیدت کی ایک اور مثال سامنے آگئی، سید صاحب نے حکیم الشعراء امجد حیدر آبادی کی ایک کتاب گلستان امجد پر تبصرہ کیا، یہ کتاب سعدی کی گلستاں کا اردو ترجمہ ہے۔ سید صاحب نے اسے کس طرح دیکھا، یہ دیکھنے کی چیز ہے، لکھتے ہیں کہ:

> کہتے ہیں کہ ہم سے پہلے دو سعدی گزرے ہیں ایک سعدی شیرازی اور ایک سعدی دکھنی، سعدی دکھنی کا حال اور مقال گو بعض تذکروں میں مذکور ہے مگر ان کی شخصیت کے تاریخی شواہد کی پوری تحقیق ابھی نہیں ہوئی ہے، بہر حال یہ تو زمانہ ماضی کا بیان ہے۔
>
> زمانہ حال نے ہمارے سامنے ایک تاریخی سعدی دکھنی کو پیش کر دیا ہے جس کی شخصیت میں کسی شک وشبہہ کی گنجایش نہیں۔
>
> یہ دکھنی سعدی حکیم الشعراء امجد حیدر آبادی ہیں۔

دونوں سعدیوں میں عجیب مماثلت ہے، وہ بھی صوفی یہ بھی صوفی، وہ بھی شاعر یہ بھی شاعر، وہ بھی چھوٹے چھوٹے فقروں والی نثر کی پیالیوں میں قند و نبات گھولنے والے اور یہ بھی، وہ بھی نظم و نثر کو ترتیب دے کر شراب آتشہ تیار کرنے والے اور یہ بھی، اخلاق و نصیحت کی تلخی کو شہد و شکر میں ملا کر وہ بھی پلاتے تھے اور یہ بھی پلاتے ہیں۔ مجاز کو حقیقت کا پردہ وہ بھی بناتے تھے اور یہ بھی بناتے ہیں۔

اس مماثلت نے وحدت واتحاد کی صورت اختیار کی اور وہ گلستاں جو سعدی شیرازی کی تھی، سعدی

دکن کی بن کر نمودار ہوئی، کہنے کو تو یہ سعدی کی گلستاں کا ترجمہ ہے مگر حقیقت میں اس میں امجد نے سعدی کے خزانۂ خیال پر اس طرح قبضہ کیا ہے کہ وہ قابض کی ملک ہو گیا ہے۔

دکن میں گلبرگہ بھی ہے اور بیدر و بیجاپور بھی، آج کی جغرافی لکیروں میں یہ قانونی لحاظ سے کرناٹک کے ہیں تو پھر دکن اور کرناٹک ان معنوں میں مترادف ہیں کہ دکھنی اردو کا پہلا بیج جس کی طرف سید صاحب نے اشارہ کیا اس کا فخر سرزمین کرناٹک ہی کو جاتا ہے، دکھنی اردو کے پہلے شاعر اور نثر نگار ہونے کا اعزاز عام طور سے خواجہ گیسو دراز کو معراج العاشقین اور ہدایت نامہ جیسی اولین کتابوں کی وجہ سے دیا جاتا ہے۔ اصحاب تحقیق عموماً کسی ایک کلمہ پر کم ہی متفق ہوتے ہیں اسی لیے بعض حضرات شیخ عین الدین گنج العلم متوفی ۷۹۵ھ کے بعض رسالوں کا ذکر کرتے ہیں اور بعض خواجہ گیسو دراز کے والد سید یوسف کو اردو نثر کا بانی سمجھتے ہیں۔ (دکن میں اردو نصیر الدین ہاشمی ص ۴۱)

اس اختلاف کے باوجود اس پر سب متفق ہیں کہ خواجہ گیسو دراز کی بستی گلبرگہ، کرناٹک کی سرزمین سے وابستہ رہی۔ یہ تو آغاز کی بات ہے ورنہ ارتقا کی منزل دیکھی جائے تو ویلور میں جب کرمانی نشان حیدری لکھ رہے تھے تو ٹھیک اسی زمانہ میں یعنی ۱۸۰۱ء میں غوثی وہ مثنوی اردو میں لکھ رہے تھے جس میں میر صادق کی غداری کی داستان تھی، غوثی کی زبان دانی اور شاعری کو تفصیل سے جاننے کے لیے ڈاکٹر آمنہ خاتون کی کتاب ریاست میسور میں اردو بہترین کتاب ہے۔ اس سے بڑھ کر چند ہی کتابیں ہوں گی، کتاب کے متعلق بجا طور پر دعویٰ کیا گیا کہ پچیس تیس سال کے عرصے میں ریاست میسور میں اردو کا جو ذخیرہ فراہم کیا ہے وہ نہ کوئی اور فراہم کر سکا اور نہ اس کا فراہم کرنا اب ممکن ہے۔ یہ کتاب ڈاکٹر آمنہ کے شریک زندگی اور شریک ترتیب مولانا محمد خاں نے معارف کو ۱۹۶۱ء میں بھیجی تھی، تبصرہ معارف میں شائع ہوا اور ہمارے موضوع کے لیے ایک اور بہانہ مل گیا، اردو کے ارتقا کے حوالے سے مفرح القلوب کا ذکر بھی کیا جانا چاہیے، حسن علی عزت جو ٹیپو کے دربار کے ملک الشعراء تھے، دو صدیوں سے بھی زیادہ پہلے کے ان حسن علی عزت کی شاعری کی سلاست اور روانی کی جانب محققین نے توجہ دلائی۔ دو صدی پہلے خطۂ میسور میں ایسے اشعار! کمال ہے کم سن اردو کی جلوہ گری کا، کہ:

گلہ خاں کرتا ہوں سلطان کا اب تم سو بیان
ہے عجب کج طرز اس کا طرفہ تر ہے داستان
خوش شکل آواز خوب، رو بھوتے نازک گلبدن
مہ لقا زن اچھی، غنچہ دہن، خندہ لبان

قبائے زرشہ خاور بدن پوساز کیا | کہ عزم طوف در شاہ دلنواز کیا
کہ جس کی دیکھ شجاعت کو روز روشن میں | سپاہی فلک از بس کہ احتراز کیا
خلیق ایسے کہ جب چہائے کہ بات کریں | گویا کہ شیشہ عطر و گلاب باز کیا

کرناٹک کا اردو سے جیسے کوئی فطری رشتہ رہا ہے، مہاراجہ سری کرشن راج کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ اپنے آباواجداد کی طرح اردو اور فارسی میں لکھنے پڑھنے کی بڑی قابلیت رکھتے تھے، اس قول کی تائید میں ان کی وہ تقریر ہی کافی ہے جو انہوں نے میسور کی جامع مسجد کے افتتاح کے موقع پر کی تھی۔ یہ سید عبدالخالق کی کتاب میسور میں اردو میں بحوالہ تاریخ میسور مرتبہ مولوی عبدالقادر نقل کی گئی ہے۔ چند جملے مہاراجہ میسور کی اردو کے نقل کرنا مناسب ہوگا، یہ تقریر ۱۹۰۲ء میں ان کی تاج پوشی کے بعد کی ہے:

حضرات مجھ کو آج نہایت خوشی ہے کہ یہاں آکر اس نئی مسجد میسور کو میں آپ کی عبادت کے لیے افتتاح کروں۔ مجھ کو اس مسجد سے شخصی اور خاندانی تعلق ہے۔ جب کہ پایۂ تخت ۱۷۹۹ء میں میسور کو منتقل ہوا۔ یہاں پر کوئی جامع مسجد نہ تھی، اس لیے وہ مسلمان جو سرنگپٹن سے اس شہر کو ہجرت کیے تھے ایک ایسی مسجد بنانے کے لیے درخواست دی تھی اور ان کی اس درخواست کو مرحوم میرے جد نے قبول فرمایا، یہ مسجد بنا ہوئی اور اس کی نگہداشت کے لیے کافی نقد عطیہ دیا گیا اور مفلس مسافروں کے لیے لنگر کھولا گیا، چندے بعد مسلمانوں کی جمعیت یہاں زیادہ ہوئی اور ان کی عبادت کے لیے مسجد میں گنجائش نہ ہونے سے کس مپرسی کی حالت میں واقع ہوئی، تخمیناً دس سال آگے سے تعمیر کا خیال پیدا ہوا اور اب میرے مہند سین کے زیر نگرانی دوبارہ تیس پر آٹھ ہزار روپیہ کی لاگت تیار ہوئی۔ یہ مسجد قدیم زمانہ کی یادگار ہے۔ خدا اس کو بہت سی آئندہ نسلوں تک آباد رکھے آمین۔

یہ کتاب بھی دار المصنفین کے لیے مصنف نے بخط خود بڑے ارمان سے بھیجی تھی، معارف میں تبصرہ اس پر بھی ہوا اور اس کی وجہ سے ہم کو یہ موقع ملا کہ دار المصنفین اور کرناٹک کے نازک لیکن نہایت قیمتی رشتوں کو یاد کر سکیں۔ یہ وہ کتابیں ہیں جو کرناٹک میں اردو کے کارواں کے لیے صدائے جرس ہیں یقیناً علمی مذاکروں میں ان کا ذکر کیا جاتا رہے گا، دل تو چاہتا ہے کہ میسور میں اردو کتاب میں گذشتہ صدی کے جن شاعروں کا کلام یکجا کیا گیا ہے، اس پر تفصیل سے کلام کیا جائے۔

کرناٹک میں اردو کی تاریخ کو دوام عطا کرنے میں میرے نزدیک ڈاکٹر آمنہ خاتون کا ذکر ہمیشہ اعلی و بلند پایہ الفاظ سے کیا جائے گا، ان کی ایک کتاب لطائف السعادت شائع ہوئی تو ڈاکٹر محی الدین قادری زور

نے بالکل صحیح لکھا کہ ڈاکٹر آمنہ انشا اور ان کے عہد پر ایک خصوصی ماہر کا درجہ حاصل کرچکنے کے ساتھ ساتھ اردو کے تحقیقی ادب میں معیاری اضافہ کرنے کی صلاحیت بھی رکھتی ہیں۔

کرناٹک میں اردو کا موضوع ایک سمندر سے شناسائی کے مترادف ہے، خصوصاً آزادی ہند کے بعد کرناٹک نے جس طرح عروس اردو کی مشاطگی کی ہے اور بیدر، گلبرگہ، رائچور سے ہوتے ہوئے بنگلور میسور اور بحر عرب کے سواحل میں منگلور اور بھٹکل جیسے خطوں کو اردو تہذیب و ثقافت اور اردو علم و ادب کی روشن ترین روایات سے مالا مال کیا ہے۔ وہ پیش نظر موضوع کا لازمی جزو ہے۔

تحقیق، سیرت نگاری، تذکرہ نگاری، قدیم مخطوطات کی تدوین، متون کی ترتیب کے ساتھ ساتھ شعر، افسانہ، صحافت ہر جگہ کرناٹک نے اپنا دعویٰ قائم کردیا کہ اب شمال کے لیے جنوب کو اسی عقیدت سے دیکھنے کی ضرورت ہے جیسے صدیوں پہلے دلی نے خود کو پرکشش بنانے میں جنوب کو اپنے دل میں جگہ دی تھی۔ ہماری نظر سے ایک کتاب کرناٹک میں اردو افسانہ کے نام سے گزری، قاضی ضیا نے اس میں انتخاب کے عمل کے ساتھ تنقیدی مطالعہ کو بھی شامل کردیا۔ ممتاز شیریں، سلیم تمنائی، مظہر امید حمید سہروردی، انل ٹھکر، قاضی انیس الحق کیسے کیسے نام کرناٹک کے رشتے سے نمایاں ہوگئے۔

البتہ یہاں ایک ایسے صاحب علم و قلم کا ذکر بے محل نہ ہوگا جنہوں نے عہد حاضر میں دکنیات کے تعلق سے نصیر الدین ہاشمی اور ڈاکٹر زور کی یاد دلادی ہے، یہ شخصیت ڈاکٹر راہی فدائی کی ہے، جنہوں نے اپنی کل متاع حیات کو سرمایہ دکنیات میں بدل دیا، اس سرمایہ میں تحقیق، تنقید، ادب اور شعر کی تمام ثروتیں نظر آتی ہیں، باقیات ایک جہاں، تجزیہ، اکتساب نظر کڈپہ میں اردو، نقوش بلند فکر، قدیم ہندوستان میں علوم دین کے سرچشمے، استشہاد، مدرکات، مصدقات، گنج شائیگاں، شواہد، مرأۃ الحق ادبیات ویلور، علامہ باقر آگاہ، جنوب کے اصحاب کمال، تذکرہ محدثین جنوب، یہ تو ان کے اس نثری سفر کی منزلیں ہیں، جو ۱۹۸۰ء سے شروع ہوا، شعری پرواز اس سے بھی پہلے کی یعنی ۱۹۷۴ء کی ہے، ایک نہیں دسیوں مجموعے اور ان کے نام، ڈاکٹر راہی فدائی کی انفرادیت کے گواہ بنتے رہے، جیسے انتسللہ انامل، ترقیم، مصداق، ایہاالناس، نبراس، فبہا، یاصاحب الجمال استدراک، استعجاب، استیعاب وغیرہ۔

اب ڈاکٹر راہی کا صرف جنوب ہی نہیں کل دنیائے اردو میں سکہ جاری ہے، ہمارے لیے وہ اس لیے بھی محبوب تر ہیں کہ ان کا علمی رشتہ سب سے زیادہ دارالمصنّفین اور معارف سے استوار ہے۔ حال ہی میں شفیق پروین کا ایک مجموعہ نظر سے گزرا، نام ہی کتنا دلکش ہے، جھیل تن میں چاند اتر گئے کئی، ناموں کو گنانے کی ہمت نہیں ورنہ صرف گلبرگہ اور بنگلور کی اردو ثروت پر ایک ضخیم کتاب تیار ہوسکتی

ہے۔

ہاں ایک بات انجمن ترقی اردو کے لیے بھی، سابق ناظم دارالمصنّفین سید صباح الدین عبدالرحمن نے ایک بار معارف میں لکھا تھا کہ دارالمصنّفین کو اس ادارے سے دیرینہ لگاؤ رہا ہے کیوں کہ اس کے ابتدائی روح رواں مولانا شبلی تھے، ان کے بعد یہاں کے لوگ کسی نہ کسی طرح ہر زمانہ میں اس سے وابستہ رہے۔ معارف میں انجمن ترقی اردو کی کوششوں کو برابر یہ کہہ کر تسلیم کیا گیا کہ سرمایہ کی کمی اور ناسازگار حالات کے باوجود اس کی کارکردگی میں روز بروز اضافہ ہوتا رہا۔ ایک بار ڈاکٹر خلیق انجم مرحوم جنرل سکریٹری انجمن ترقی اردو کی تعریف یوں کی کہ انہوں نے اردو گھر بنوایا، اس کے لیے وہ ہر طرح کی مبارکباد کے مستحق ہیں، شاہ جہاں کو دہلی کے لعل قلعہ کی تعمیر میں شاید اتنی مشکلوں اور پریشانیوں کا سامنا نہ کرنا پڑا ہوگا جتنا ڈاکٹر خلیق انجم کو اردو گھر بنوانے میں پڑا ہوگا۔ یہ اضافی کلمات تھے، موضوع کے سلسلے میں یہی کہنا ہے کہ معارف میں دکن کے تعلق سے مسلسل اظہار خیال ہوتا رہا، دائرۃ المعارف کے تعلق سے تو ہر خبر شذرات کی زینت بنتی رہی۔ حیدرآباد کی علمی شخصیات کے ذاتی کتب خانوں کی بیش قیمت کتابوں کا علم ہوتا تو معارف نہایت پرجوش انداز میں ذکر کرتا جیسے مولوی سید علی اصغر بلگرامی ناظم آثار قدیمہ نے ایک خط میں اپنے ذاتی کتب خانہ کے کچھ نوادر کا ذکر کیا جیسے مصباح المتہجد، فقہ شیعہ کی کتاب، سید صاحب نے لکھا کہ اس کا قلمی نسخہ متعدد حیثیات سے نادرۂ روزگار ہے۔ ۵۷۸ھ کے اس مخطوطہ کی کتابت سیاہی کے بجائے شیرۂ خرما سے ہوئی۔ ایک جگہ لکھا کہ دائرۃ المعارف جو قابل قدر خدمات انجام دے رہا ہے ان کا جواب ہندوستان تو کیا مصر و قسطنطنیہ بھی نہیں دے سکتے۔ دائرۃ المعارف کی کتابوں کی صرف داد ہی نہیں معارف بڑے کارآمد مشورے بھی دیتا رہا۔ ظاہری محاسن کے ساتھ معارف نے بھی خواہش ظاہر کی کہ انڈکس، مختلف نسخوں کی بہم رسانی، مقابلہ، نسخہ مطبوعہ کی کیفیت اور نمایاں خصوصیتوں کا اظہار، نسخہ ناقص ہو تو وہیں حاشیہ میں اس کا اظہار یا بیاض کا چھوڑنا، مصنف کے حالات اور تصنیفات کا ذکر وغیرہ کی تفصیلات بھی ہوں، حیدرآباد کی علمی سرگرمیوں کی طرح معارف جنوب کی تعلیمی زندگی سے بھی وابستہ رہتا، مدراس میں مجلس علمائے جنوبی ہند کی بنیاد پڑی، ۱۹۱۸ء میں ترچناپلی میں اس کے جلسہ میں مدرسہ لطیفیہ اور باقیات الصالحات کی کارکردگی کا جائزہ لیا گیا تو معارف نے بڑے فخر سے لکھا کہ ہندوستان کے دوسرے اسلامی صوبوں کے برعکس مدراس میں اسلامی سرمایہ کی کمی نہیں۔

اسی طرح اورنگ آباد کی انجمن ترقی اردو نے سائنس نام کا رسالہ نکالا تو اس کا بڑی خوشی سے خیر

مقدم کیا اور توقع ظاہر کی کہ اس رسالہ کو بقا کی دولت ملے گی، حیدر آباد سے ایک انگریزی رسالہ کی خبر خود اس کے مدیر ایم. پکتھال نے دی تو معارف نے پھر اس امید کا اظہار کیا کہ دکن اور ہند کے ارباب ذوق اس متوقع رسالہ کی پوری قدر کریں گے۔ ایک جگہ دائرۃ المعارف کا ذکر ان شاندار الفاظ میں کیا کہ حقیقت یہ ہے کہ ہماری ناقدری کے باوجود دائرۃ المعارف جو علمی ذخیرہ منظر عام پر لاتا رہتا ہے وہ نہ صرف مسلمانوں پر بلکہ اسلام پر احسان ہے۔ ش ۲۔ ۱۱۹۔ ایک اور جگہ لکھا کہ دائرۃ المعارف کی کتابوں نے نسیم بہار بن کر حیدر آباد کی علم دوستی کی خوشبو چار دانگ عالم میں پھیلادی۔ ش۔ ۲۔ ۱۶۰۔ ایک جگہ دائرۃ المعارف کو مشرق میں اپنی طرز کی واحد علمی مجلس سے تعبیر کیا.... ۳۴۸۔ دائرہ ہی کیا دکن کے ہر ادارہ کے تعلق سے معارف اپنے قارئین کو مطلع کرتا۔ ایک جگہ لکھا کہ کتب خانہ آصفیہ، حیدر آباد کی علمی عمارت کا چوتھا ستون ہے۔ یہ ہندوستان کے تمام شرقی کتب خانوں سے بہتر ہے۔ ۱۶۱

اسی طرح تامل ناڈو مالا بار، کیرالا وغیرہ کا ذکر جوش و جذبہ سرشاری سے ہے۔ ویلور کے باقیات صالحات کا ذکر کئی بار ہے، عمر آباد کا بیان ہے، کرنول کے مدرسہ عربیہ اسلامیہ کا ذکر ہے۔ دینی تعلیم کے ساتھ وہ اردو کے ذکر سے بے خبر نہیں رہتا، معلوم ہوا کہ نئے نئے مدارس میں کہیں اردو زبان کا کورس شامل کیا گیا ہے تو معارف نے لکھا مگر پھر بھی اردو کی اشاعت کا کام کرنے والوں پر فرض ہے کہ ادھر توجہ کریں۔ لکھا کہ جنوبی ہند اور مدراس میں تو ایسے لوگ بھی ہیں جو نظم و نثر اردو میں شمالی ہند کے لوگوں سے کسی طرح کم نہیں۔

بنگلور کے محمد علی ہال میں سید صاحب نے تقریر بھی کی، میسور کو انہوں نے انتظامات اور قانونی آزادی کی حیثیت سے اول درجہ کی ریاست پایا لیکن افسوس اس کا کیا کہ مسلمانوں کی تعلیمی حالت اچھی نہیں، لکھا کہ چار پانچ فیصد سے زیادہ نہیں لیکن ایک مولانا مسلم ویلوری کا ذکر کیا کہ انہوں نے چھوٹا سا یتیم خانہ قائم کیا اور بھی تفصیلات ہیں۔

معارف میں جامعہ عثمانیہ کا بھی ذکر ہے، ایک جملہ سن لیجئے لکھا کہ جب کبھی ہندوستان کو قومی تعلیم کا خیال آئے گا تو عثمانیہ یونیورسٹی ہی اس خیال کا سنگ بنیاد قرار پائے گی۔

سید صاحب نے کبھی بنگلور میں تین خطبے بھی دیے تھے۔ پہلا دین کامل کے عنوان سے، دوسرا خطبہ زندہ نبی کے عنوان سے تھا۔ تیسرا عمومی بیان تھا۔

ایک جگہ سید صاحب نے لکھا کہ کرناٹک کے علاقہ میں تاریخی شہر ارکاٹ کے قریب ترپاتور مسلمانوں کا خاص قصبہ ہے، وہاں کی انجمن محمدیہ کا انہوں نے معائنہ کیا۔ یہاں بچوں کو اردو بولتے

پڑھتے دیکھ کر سید صاحب نے لکھا کہ اردو کی ترقی بھی ایک عجوبہ ہے۔ مسلمان اگر تھوڑی توجہ کریں تو اردو کہاں سے کہاں پہنچ سکتی ہے۔

آخر میں یہی عرض کرنا ہے کہ دار المصنّفین اور جنوب ہند کے روابط کی ایک مختصر سی فہرست پیش کی گئی ورنہ افضل العلماء ڈاکٹر عبدالحق، مولانا یوسف کوکن، صبغۃ اللہ بختیاری، میر ولی الدین، ڈاکٹر حمید اللہ جیسی شخصیات ہیں، یا پھر باب دکن برہان پور سے مالابار تک خدا جانے کتنے آبدار جواہر اور موتی ہیں جو دار المصنّفین کی اس لڑی میں پروئے جاسکتے ہیں، اور ایک اہم پہلو کرناٹک کی اردو صحافت کا ہے، سالار، پاسبان، نشیمن، گلبن، سوغات جیسے رسالوں اور جریدوں نے جریدہ عالم پر جس طرح اپنے وجود کے دوام کو ثبت کیا ہے۔ وہ ایک الگ اور مفصل گفتگو کا متقاضی ہے۔ جس دن یہ کام ہو گیا اس دن یقیناً ادبی تاریخ کا ایک دلچسپ مرقع ہمارے سامنے ہوگا۔ ان شاء اللہ!

کتب حوالہ:

۱۔ نقوش سلیمانی، مولانا سید سلیمان ندوی
۲۔ شذرات سلیمانی، مولانا سید سلیمان ندوی
۳۔ دکھنی ہندو اور اردو، نصیر الدین ہاشمی
۴۔ دکن میں اردو، نصیر الدین ہاشمی
۵۔ دکن کی ابتدا، ڈاکٹر آمنہ خاتون
۶۔ ریاست میسور میں اردو، ڈاکٹر آمنہ خاتون،
۷۔ میسور میں اردو، محمد سعید عبدالخالق مولانا محمد خان
۸۔ مدراس میں اردو، نصیر الدین ہاشمی
۹۔ دکھنی قدیم اردو کے چند تحقیقی مضامین،
۱۰۔ خواتین دکن کی اردو خدمات، نصیر الدین ہاشمی
۱۱۔ جھیل تن میں چاند اتر گئے کئی، شفیق پروین

انجمن ترقی اردو ہند کے زیر اہتمام بنگلور کے مذاکرہ علمی میں پڑھا گیا یہ مضمون جزوی حذف و اضافہ کے ساتھ پیش ہے۔

میڈیا میں مسلمانوں کی حصے داری

محمد علم اللہ

ریسرچ اسکالر ڈاکٹر کے آر نارائنن سینٹر فار دلت اینڈ مائنارٹی اسٹڈیز، جامعہ ملیہ اسلامیہ

alamislahi@gmail.com

یہ بات مسلمانوں کے ذہن میں بہت عام ہے کہ اسلام اور مسلمانوں کو بدنام کرنے میں میڈیا نے بہت اہم رول ادا کیا ہے اور اس کا معاندانہ رویہ اسلام اور مسلمانوں کے ساتھ آج بھی جاری ہے۔ مسلمان اس سوئے ظن میں حق بجانب بھی ہیں۔ لیکن دوسری طرف میڈیا جب اسلام کے خلاف کوئی بات نہ کہے تب بھی دنیا میں بدعقیدگی اور گمراہی کو عام ہی کر رہا ہے کیونکہ ٹی وی اور ریڈیو پر نشر کی جانے والی فحاشیاں اور گمراہیاں ہر گھر میں ان ہی کے ذریعے عام ہو رہی ہیں۔ اگرچہ یہ دیکھنے میں مسلمانوں کے خلاف سازش نہیں لیکن اسلام کی تعلیمات کے خلاف ہے۔ اس لئے زیادہ ضروری ہے کہ مسلمان اس کی روک تھام کے لیے پہل کریں، کیونکہ جس سطح پر دشمن فحاشی پھیلا رہا ہے اس سے کہیں بڑے پیمانے پر اس کی روک تھام ہونی چاہیے اور مسلمان تو خیر امت ہیں اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر ان کی بنیادی ذمے داری ہے۔

اس تناظر میں جب ہم موجودہ میڈیا اور اس کی کارکردگی کا جائزہ لیتے ہیں تو تین چیزیں ابھر کر سامنے آتی ہیں:

۱۔ میڈیا کا اسلام کو بدنام کرنے میں بہت ہی اہم رول ہے۔

۲۔ میڈیا بدعقیدگی اور فحاشی کو عام کر رہا ہے۔

۳۔ ضروری ہے کہ مسلمان میڈیا کو اپنے استعمال میں لائیں۔

پہلے نکتے پر بے شمار لوگوں نے باتیں کیں اور یہ لکھا ہے کہ میڈیا کا رویہ اسلام کے ساتھ کیسا رہا ہے۔ لیکن الیکٹرانک میڈیا، جس طرح سے فحاشی اور بدعقیدگی کو پھیلا رہا ہے، اسے بھی دور کرنا اشد ضروری ہے کیونکہ میڈیا کی ضرورت آج ہر انسان کو ہے۔ اس کے ذریعے دلچسپ اور آسان انداز سے معلومات میں اضافہ بھی ہوتا ہے، لیکن ساتھ ساتھ فحاشی بھی عام ہوتی ہے، جسے گوارا کرنا اس کی حمایت کرنا ہے۔ بالخصوص ایک مسلمان، جو خیر امت کا فرد ہے، وہ اپنے اس منصب کی ذمے داری اسی وقت پوری کر سکتا

ہے جب وہ فحاشی پر خاموشی اختیار نہ کرے بلکہ اس کی روک تھام کرے اور اسلام پر ہونے والی تہمت تراشیوں کا کھل کر جواب دے۔اس مہم کو چلانے کے لیے خود اس کے پاس کوئی ایسا ذریعہ یا طاقت ہونی چاہیے جو کار آمد ہو اور وہ طاقت یقیناً میڈیا ہی ہے، بالخصوص الیکٹرانک میڈیا۔اس لئے اس مضمون میں ہم اسی پر گفتگو کریں گے۔

ضروری ہے کہ ہم پہلے میڈیا کے معنی اور مفہوم کو سمجھ لیں۔میڈیا دراصل معلومات کو جمع کرنے اور اس کی ترسیل کو کہتے ہیں۔اس کی دو قسمیں ہیں:

۱۔پرنٹ میڈیا:اس میں روزنامے اور دیگر مطبوعہ کتب و مواد شامل ہیں۔

۲۔الیکٹرانک میڈیا:اس میں ریڈیو،ٹی وی،انٹرنیٹ اور سی ڈی،ڈی وی ڈیز وغیرہ آتے ہیں۔

ایک آدمی،جو پڑھنا لکھنا جانتا ہو اس کے لیے تو پرنٹ میڈیا بہت ہی فائدہ مند ہوتا ہے لیکن دیگر افراد، جنہیں پڑھائی لکھائی سے کوئی شغف اور واسطہ نہیں،پرنٹ میڈیا ان کے لیے کورے کاغذ کے علاوہ اور کچھ نہیں۔وہیں الیکٹرانک میڈیا دونوں طرح کے افراد کے لیے یکساں طور پر سود مند اور کار آمد ہے۔ اسی لئے آج کتابوں،رسالوں اور اخباروں سے زیادہ ریڈیو ٹیلی وژن اور ویب سائٹس لوگوں پر اثر انداز ہو رہے ہیں اور اسی چیز کو مد نظر رکھتے ہوئے غیر قوموں نے اس کے اندر قدم رکھا اور ترقی حاصل کی اور جس چیز سے ان کے ذاتی مفاد اور ان کے آبائی دین کو خطرہ لاحق ہوتا نظر آیا اسے ان لوگوں نے ہدف ملامت بنایا،اس میں بدنمائیاں پیدا کیں،اس کے حقائق کو مسخ کر کے لوگوں کے سامنے پیش کیا اور یقیناً ان کے لیے خطرہ اسلام ہی تھا کیونکہ اسلام دیگر مصنوعی اور تحریف شدہ ادیان کی طرح نہ کسی سے گناہ اور برائی میں سمجھوتہ کرتا ہے اور نہ ہی اپنے ماننے والوں کو اس کی اجازت دیتا ہے۔چناں چہ نہ صرف اسلام بلکہ ہر اس حقیقت پر پردہ ڈالا گیا،جس کے واضح ہو جانے سے ان کے مفادات کو ٹھیس لگتی یا ان کے اپنے مخالفین کی مطلب براری ہوتی تھی۔

گزشتہ دو عشروں سے پوری دنیا پر الیکٹرانک میڈیا کی یلغار ہے،جس نے معاشرتی اور اخلاقی اقدار کو بدل کر رکھ دیا ہے۔اگرچہ اخبارات ورسائل میں بھی روز افزوں ترقی کا عمل جاری رہا لیکن نجی ٹی وی چینلوں نے اسلامی ثقافت پر گہری ضرب لگانے میں کلیدی کردار ادا کیا۔امریکی فلمی مرکز ہالی ووڈ اسلام مخالف سازشوں کا مرکز گردانا جاتا ہے۔ایک صدی سے زائد مدت سے یہاں فلموں کے ذریعے اسلام اور مسلمانوں کے خلاف نفرت و کدورت، بغض و کینہ پوری دنیا میں پھیلایا جا رہا ہے۔ بیسویں صدی کی آخری دو دہائیوں میں ہالی ووڈ نے مسلم دشمنی پر مبنی فلمیں ''ڈیلٹا فورس''،''انتقام''،''آسمان کی چوری''

بنائیں، جب کہ ورلڈ ٹریڈ سنٹر کا تجرباتی ڈراما اسٹیج کرنے کے لیے ۱۹۹۲ء میں ''حقیقی جھوٹ'' اور ''حصار'' وغیرہ نامی فلمیں تیار کی گئیں۔ ان فلموں میں اسلام اور مسلمانوں کا تشخص بری طرح مجروح کیا گیا۔

باطل نے دنیا بھر کی معیشت اور میڈیا پر اپنا قبضہ جمار کھا ہے۔ اسلام کے خلاف پروپیگنڈا اس میڈیا کا مستقل موضوع ہے۔ کبھی مغربی ممالک کے اخبارات میں توہین آمیز خاکے شائع کیے جاتے ہیں اور کبھی ہالینڈ میں قرآن اور اسلامی شعائر کے خلاف فلمیں بنائی جاتی ہیں۔ مغربی میڈیا وقتاً فوقتاً مسلمانوں کو ''دہشت گرد''، ''جہادی'' اور ''بنیاد پرست'' ثابت کرنے کے لیے اپنی مہم چلائے رکھتا ہے۔

حق کے خلاف باطل کا اتحاد کوئی نئی چیز نہیں لیکن آج یہ نمایاں اس لیے ہے کہ الیکٹرانک میڈیا کے فروغ نے دنیا کو ''عالمی گاؤں'' بنا دیا ہے۔ کسی کے دل میں یہ خیال آسکتا ہے کہ جس دنیا کو ہم اسلام مخالف بتا رہے ہیں وہ تو حقوق انسانی کی پرچم بردار، فکر و عمل کی آزادی کی حامی، عالمی بھائی چارے اور جمہوریت کی داعی ہے، ہم اسے اسلام مخالف کیسے کہہ سکتے ہیں؟ جواب اس کا یہ ہے کہ نئی تہذیب کے خود فریب ترقی یافتہ انسان نے کائنات کے مرکز (نیوکلیس) سے خالق اور رب العالمین اللہ جل شانہ کو ہٹا کر اس کی جگہ ''مادہ'' کو بٹھا رکھا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اول بھی مادہ تھا اور آخر بھی مادہ ہے، درمیان میں ترقی کے مختلف مراحل ہیں اور انسان اس ترقی کا نقطہ آخر ہے۔ جنت اور دوزخ، جو کچھ ہے وہ انسان کی اسی زندگی میں ہے، زندگی ختم تو سب کچھ ختم۔ اب جتنی بھی اچھی کارآمد اور مثبت قدریں مثلاً وقت اور عہد کی پابندی وغیرہ ہمیں جدید مادی تہذیب میں نظر آتی ہیں وہ اس لیے نہیں ہیں کہ وہ بذات خود اچھی ہیں بلکہ صرف اس لئے کہ وہ فائدہ اور منافع میں اضافے کا باعث ہوتی ہیں۔ کسی غیر پیداواری سرگرمی، نیکی یا ہستی کی اس کمرشیل تہذیب میں کوئی گنجائش نہیں۔ اس تہذیب میں انسان کی حیثیت اس کے صارف ہونے کی صلاحیت متعین کرتی ہے، جو جتنا بڑا صارف ہے یا جتنا زیادہ صرف کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے وہ اتنا ہی بڑا ہے۔ جو قوت خرید ہی نہیں رکھتا اس کی کوئی ضرورت نہیں اسے مرنے کے لیے چھوڑ دیا جائے گا۔ انفاق اور ایثار کی اس تہذیب میں اس لئے کوئی ضرورت نہیں کہ یہ دونوں غیر پیداواری سرگرمیاں ہیں۔ لہٰذا اس تہذیب میں حقوق انسانی، اخوت اور آزادی کا جو تصور ہے اس پر کوئی کنٹرول نہیں رکھا گیا ہے۔ وہ مادر پدر آزاد اور بے لگام ہے۔ چوں کہ دنیا ایک بازار ہے اور انسان محض ایک صارف، لہٰذا ہر چیز کو ''بازار'' کی قوتوں کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا گیا ہے۔ یہ جو آج ہر طرف ''عالمی اقتصادی بحران'' کا چرچا ہے یہ بھی دراصل ان ہی بازار کی قوتوں کا لایا ہوا ہے اور فی الواقع یہ اخلاقی اقدار کا

بحران ہے اور میڈیا کی تشہیری جنگ اس کا سب سے بڑا اور موثر ہتھیار ہے۔ غالب کا یہ شعر:

ہیں کواکب کچھ نظر آتے ہیں کچھ

دیتے ہیں دھوکا یہ بازی گر کھلا

موجودہ ذرائع ابلاغ پر پوری طرح صادق آتا ہے۔ ہمیں کتابوں میں پڑھایا جاتا ہے کہ ''میڈیا کا کام لوگوں کو سچ بتانا اور حقائق سے آگاہ کرنا ہے''۔ یہ بیان اس معنی میں غلط ہے کہ آج میڈیا کا استعمال حقائق کو آشکار کرنے سے زیادہ حقائق کو چھپانے یا توڑ مروڑ کر پیش کرنے یا جھوٹ کو پھیلانے کے لیے کیا جاتا ہے۔ موجودہ میڈیا ہماری معلومات میں اضافہ کرنے سے زیادہ ہمیں بہکانے، ورغلانے اور مشتعل کرنے کے کام کرتا ہے اور فی الواقع مہم چلاتا ہے۔ آج پورا میڈیا اور اسے استعمال کرنے والی تمام سیاسی، سماجی اور اقتصادی طاقتیں اَن تَشِیعَ الفَاحِشَۃُ فِی الَّذِینَ آمَنُوا (اہل ایمان کے اندر بداخلاقیاں پھیلیں) کے کام پر یعنی فواحش اور منکرات کے پھیلانے پر مامور ہیں۔ مادّہ کو اِلٰہ بنا لینے والی طاقتیں ہی آج میڈیا کو اخلاقی انار کی پھیلانے کا ہتھیار بنائے ہوئے ہیں۔ وہ طاقتیں ہمیں وہی بتاتی اور دکھاتی ہیں، جتنا ان کی اسکیم میں فٹ بیٹھتا ہے۔ ہم اس پورے رویے کو اسلام مخالف یا غیر اسلامی اس لیے کہتے ہیں کہ اسلام ایمان بالغیب سے شروع ہوتا ہے، جب کہ وہ ہم سے کہتے ہیں کہ جتنا آنکھوں سے دیکھو بس اتنے ہی پر یقین کرو۔ دنیا کو سماجی اور اخلاقی کنٹرول سے آزاد کرنے کے لیے میڈیا کا کنٹرول انہوں نے اپنے ہاتھوں میں لے رکھا ہے۔

اس کے برعکس اسلام نہ انسان کے جذبات و خواہشات کو آزاد چھوڑتا ہے اور نہ عقل کو بے لگام چھوڑ دینے کا قائل ہے۔ وہ نفس اور قلب کا تزکیہ کرتا ہے اور عقل کے سرکش گھوڑے کے منہ میں حکمت کی لگام دیتا ہے۔ لیکن مادی تہذیب حاضر نے عقل اور خواہشات کو بے لگام چھوڑ کر انسان کو مادر پدر آزادی کا تصور دے کر وسائل حیات اور وسائل ابلاغ دونوں کو اپنے قبضے میں کر لیا ہے اور اب اس کا ہدف خود ''حیات'' پر کنٹرول حاصل کرنا ہے تاکہ موت کے خوف سے نجات مل سکے۔ مادی انسان آخرت پر یقین نہ رکھنے کے باوجود موت سے صرف اس لئے ڈرتا ہے کہ آخرت کا تصور موت کے بعد دوبارہ زندہ کیے جانے سے ہی وابستہ ہے، لہٰذا اس کا خیال ہے کہ جب وہ موت پر قابو پا جائے گا تو زندگی اپنے آپ اس کے ''اختیار'' میں آجائے گی۔ چوں کہ یوم آخرت کا مالک وہی ہے، جو زندگی اور موت کا مالک ہے، لہٰذا ان کا خیال ہے کہ آخرت کی پکڑ سے بچنے کا ایک ہی طریقہ ہے، اور وہ ہے موت اور حیات کو پوری طرح اپنے قابو میں کر لیں۔ ایک طرف تو وہ زندگی کے راز کو جاننے کی کوشش میں لگے ہوئے

ہیں اور دوسری طرف انہوں نے اس نظام فکر کے خلاف ہر طرح کی جنگ چھیڑ رکھی ہے، جو ان کی شیطانی کوششوں میں رکاوٹ ڈال سکتا ہے۔ دنیا اسلام کی حقانیت سے باخبر نہ ہو سکے، اسی لیے انہوں نے ''لہوالحدیث'' کا نظام رائج کر کے دنیا کو مجبور کر دیا ہے کہ وہ پیسے خرچ کر کے گمراہی خریدے۔ اس مہم پر اتنا زور اس لیے صرف کیا جارہا ہے کہ مسلمان پیسے خرچ کر کے کہیں قوت کا حصول نہ شروع کر دے، کہیں وہ اپنی گاڑھی محنت کی کمائی رباط الخیل میں نہ لگا دے۔ رباط الخیل اور قوت کے حصول کا معاملہ ان کے نزدیک اتنا اہم ہے کہ انہوں نے صرف لہوالحدیث ہی کے خریدنے کا انتظام نہیں کیا ہے بلکہ کوشش یہ کی ہے کہ انسان رزق حلال ہی سے پوری طرح محروم ہو جائے، کیوں کہ نہ رزق حلال ہوگا نہ مسلمان قوت اور رباط الخیل کے حصول کی طرف توجہ کرے گا۔ حرام مال کا مصرف اس سے بڑھ کر اور کیا ہو سکتا ہے کہ صرف ''لہو الحدیث'' کی خریداری کی جائے، جس کے متعلق اللہ تعالی اپنی مقدس کتاب قران مجید میں فرماتا ہے: وَاَعِدُّوا لَہُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّۃٍ وَّ مِنْ رِّبَاطِ الْخَیْلِ تُرْھِبُوْنَ بِہٖ عَدُوَّ اللّٰہِ وَعَدُوَّکُمْ وَاٰخَرِیْنَ مِنْ دُوْنِہِمْ لَا تَعْلَمُوْنَہُمْ اَللّٰہُ یَعْلَمُہُمْ۔ (انفال آیت: ۶۰) (اور تم جہاں تک تمہارا بس چلے زیادہ سے زیادہ طاقت اور تیار بندھے رہنے والے گھوڑے ان کے مقابلے کے لیے تیار رکھو، اس کے ذریعے سے اللہ کے اور اپنے دشمنوں کو اور ان دوسرے اعدا کو خوف زدہ کرو گے، جنہیں تم نہیں جانتے مگر اللہ جانتا ہے)

اس کی تفسیر میں مفسر قرآن مولانا امین احسن اصلاحی اس کا مقصد بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> یہ اس تیاری کا مقصد بیان ہوا ہے کہ اللہ کے اور تمہارے دشمنوں پر تمہاری دھاک اور ہیبت قائم رہے کہ تمہیں نرم چارہ سمجھ کر کے وہ تم پر حملہ کرنے کی جرأت نہ کریں۔ یہاں مسلمانوں کے تمام دشمنوں کو اللہ کا دشمن ٹھہرایا ہے اس لئے کہ مسلمانوں کی جنگ جس سے بھی تھی، اللہ کے دین کے لیے تھی، اس میں کسی اور چیز کا کوئی دخل نہیں تھا۔[1]

مولانا مزید لکھتے ہیں:

---

[1] تدبر قرآن۔ تاج کمپنی، دہلی، سال ۱۹۹۷ء جلد۔۳، ص: ۵۰۳

قرآن نے یہاں مسلمانوں کو حاضر سے متعلق ہدایت دیتے ہوئے ان دشمنوں کی طرف بھی ایک اشارہ کر دیا جو مستقبل قریب یا مستقبل بعید کے پردوں میں چھپے ہوئے ہیں تا کہ مسلمان دور تک نگاہ رکھ کر منصوبہ بندی کریں۔[۲]

اس روشنی میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ آج کل میڈیا، جو سامراجی حکمرانوں کا آلہ کار ہو چکا ہے، عوام الناس کے لیے مفید کم اور مضرت رساں زیادہ ہے، بلکہ محض نقصان دہ ہے۔ مسلمانوں کے لیے تو موجودہ میڈیا کسی زہر ہلاہل سے کم نہیں، میڈیا پر حق و باطل اور مثبت و منفی عناصر کا تناسب دس (۱۰) اور نوے (۹۰) فی صد کے بقدر ہے، لیکن اس کے باوجود مسلمانوں کی اس جانب سے غفلت افسوس ناک ہے اور کسی خوف ناک مستقبل کا پتہ دیتی ہے۔

ایسے حالات میں مسلمانوں کی ذمے داری ہے کہ وہ میڈیا کی اس انسانیت مخالف تشہیری جنگ کے خلاف اقدام کرنے کی کوشش کریں، کیوں کہ اس کے ذریعے ان کا مقصد ہی اسلام کو بدنام کرنے کی خاطر حربہ اپنانا، معاشرے میں بدتمیزی اور انارکی کو فروغ دینے کے ساتھ ساتھ بدعقیدگی اور کفر و شرک پھیلا کر اپنے مقصد میں کامیابی حاصل کرنا ہے۔

یہاں پر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس سلسلے میں مختصراً میڈیا کے رویے کی ایک جھلک قارئین کے سامنے پیش کر دیں تا کہ اس کی تصویر مزید واضح ہو سکے:

۱۔ اگر کہیں بم بلاسٹ ہو تو فوراً اسلامی تنظیموں کی فہرست سے نیوز چینلوں کو مزین کر دیا جاتا ہے، لیکن جیسے ہی یہ انکشاف ہوتا ہے کہ کام کسی ہندو تنظیم کا ہے تو فوراً ''مائی نیم از خان'' کی خبر ''بریکنگ نیوز'' بن جاتی ہے۔ اگر کوئی عام مسلمان چار شادی کرے تو بطور عیب اسے دکھایا جاتا ہے لیکن جب کوئی مشہور غیر مسلم نامور شخصیت دس دس رکھیل رکھے تو اس کا کوئی چرچا نہیں ہوتا بلکہ کبھی کبھار تو رکھیلوں کے لیے وہ باعث فخر بنا دیا جاتا ہے۔ جب کسی مسلمان کو بڑے جرم کے تحت گرفتار کیا جاتا ہے تو اسے سبھی دہشت گرد تنظیموں کا دوست اور رشتے دار بنا دیا جاتا ہے لیکن جب دو یا تین دنوں بعد یہ انکشاف ہوتا ہے کہ سب جھوٹ تھا اور اس کی برأت کا حکومت اعلان کر دیتی ہے تو اسے بریکنگ نیوز بنانا تو دور یا تو دکھایا ہی نہیں جاتا یا پھر فٹ لائن نیوز میں دو یا تین مرتبہ دکھا کر معاملہ کو ختم کر دیا جاتا ہے۔ اور اگر کبھی مجرم اور بم بلاسٹ کرنے والا غیر مسلم نکلتا ہے تو اس خبر کو یا تو غائب کر دیا جاتا ہے یا اس شخص کو مسلمان بنا دیا

---

[۲] تدبر قرآن۔ تاج کمپنی، دہلی، سال ۱۹۹۷ء جلد۔۳، ص: ۵۰۴

جاتا ہے گرچہ وہ کافر ہی کیوں نہ ہو۔ جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ساری دنیا یہی سمجھتی ہے کہ ہمیشہ مسلمان ہی ایسے کام کرتے ہیں اور وہی دہشت گرد ہوتے ہیں۔ مسلمان اس سازش کا اسی طاقت سے جواب نہیں دیتے جس قوت کے ساتھ یہ سازش کی جارہی ہے اور خود اپنے گلے میں بدنامی کا طوق ڈال لیتے ہیں۔ اگر جواب دیا بھی جاتا ہے تو اردو اخبارات اور مجلوں میں، جنھیں خود مسلمانوں کے علاوہ کوئی اور نہیں پڑھتا اور مسلمان اپنے جوابات دے کر خود ہی پڑھ کر خوش ہو جاتے ہیں۔

۲۔ کہیں گھریلو ماحول پر مبنی پروگرام بنائے جاتے ہیں، جن میں عورتوں کی آپسی لڑائی جھگڑے اور میاں بیوی کے درمیان اختلاف کیسے بڑھیں؟ دکھایا جاتا ہے، حالاں کہ ظاہری مقصد، ان مفاسد کی روک تھام ہوتا ہے لیکن جس انداز سے دکھایا جاتا ہے اس سے لوگ سدھرنے کے بجائے اور زیادہ بگڑ جاتے ہیں۔ ضروری نہیں کہ آپ زنا کی روک تھام کے لیے زنا کرکے لوگوں کو دکھائیں لیکن موجودہ الیکٹرانک میڈیا کا طریقہ یہی بن گیا ہے تاکہ زیادہ سے زیادہ لوگ دیکھیں، ان کی ٹی آر پی[۳] بڑھے۔ اس لئے مرچ مسالہ بھی لگا دیا جاتا ہے کیوں کہ موجودہ میڈیا کا مقصد برائی کو روکنا اور فحاشی کو ختم کرنا نہیں بلکہ فحاشی کو بڑھانا اور پیسہ کمانا ہے۔ اگر غور کیا جائے تو موجودہ میڈیا اس آیت کے پیمانے پر کھرا اترتا ہے: اِنَّمَا جَزٰٓؤُا الَّذِیْنَ یُحَارِبُوْنَ اللّٰہَ وَرَسُوْلَہٗ (المائدہ آیت: ۳۳) (ان کی سزا، جو لوگ اللہ اور اس کے رسول سے جنگ کرتے ہیں) میں میڈیا کا پہلا چہرہ داخل ہو جاتا ہے، جو اسلام یعنی اللہ اور اس کے رسول کی تعلیمات کو بدنام کرنے کی کوشش کررہا ہے۔ اور وَ یَسْعَوْنَ فِی الْاَرْضِ فَسَادًا (سورہ المائدہ آیت ۳۳) (اور زمین میں فساد مچاتے پھرتے ہیں) میں میڈیا کا یہ چہرہ اور آگے ذکر ہونے والا چہرہ شامل ہو جاتا ہے اور ان کے لیے سزا بھی اللہ نے سخت متعین کردی کہ اَنْ یُّقَتَّلُوْٓا اَوْ یُصَلَّبُوْٓا اَوْ تُقَطَّعَ اَیْدِیْھِمْ وَ اَرْجُلُھُمْ مِّنْ خِلَافٍ اَوْ یُنْفَوْا مِنَ الْاَرْضِ ذٰلِکَ لَھُمْ خِزْیٌ فِی الدُّنْیَا وَلَھُمْ فِی الْاٰخِرَۃِ عَذَابٌ عَظِیْمٌ (سورہ المائدہ آیت ۳۳) (یہ ہے کہ وہ قتل کردیے جائیں یا پھانسی چڑھا دیے جائیں یا ان کے ہاتھ پیر مخالف سمتوں سے کاٹ دیے جائیں یا وہ ملک بدر کردیے جائیں۔ یہ ان کے لیے دنیا میں رسوائی ہے اور ان کے لیے آخرت میں بڑا عذاب ہے۔)

اس میں وہ پروگرام اور سیریل بھی آجاتے ہیں، جن میں فحاشی اور ننگے پن کو کھلے طور سے دکھایا جاتا

---

[۳] یعنی ناظرین کی تعداد جس سے کسی ٹیلیویژن چینل کو ملنے والے اشتہارات کا نرخ طے ہوتا ہے۔

ہے جسے بچے اور والدین ایک ساتھ مل کر دیکھتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بچی بڑی ہو کر اپنے بوائے فرینڈ کو اپنے ساتھ گھر میں لے آتی ہے، جسے کئی والدین فیشن اور آزادی کا نام دیتے ہیں تو کئی بول نہیں پاتے، کیونکہ یہ تربیت بچوں نے اپنے والدین کے ساتھ فلم اور سیریل دیکھ کر ہی پائی ہے۔

اسی طرح غریبوں کی عزت کو سر بازار ریلٹی شو کے نام پر خریدا اور بیچا جاتا ہے۔ ان کی نجی زندگی میں جھانک کر میاں اور بیوی میں طلاق کرانا اور کسی کو پھانسی پر چڑھا دینا یہ ریلٹی شو کی خصوصیات ہیں۔ ''آپ کی کچہری'' کے نام پر گھریلو جھگڑوں اور آپسی فسادات کو مشتہر کیا جاتا اور ان کو انصاف دلانے کے نام پر ساری دنیا کے سامنے ان کی عزت کو نیلام کر دیا جاتا ہے۔ کیا ضروری ہے کہ انصاف دنیا کے سامنے ذلیل کر کے اور دنیا کے سامنے لڑا کر دلایا جائے؟

۳۔ میڈیا نے بدعقیدگی کو پھیلانے اور بچوں کے ذہن کو کفر و شرک سے بھرنے میں نمایاں کردار ادا کیا ہے۔ ہم بچوں کے لیے آنے والے کارٹونز اور پروگرامز پر غور کریں کہ ان میں دکھایا کیا جاتا ہے؟ ہنومان، رام اور کرشن کی اسٹوری کارٹونز میں دکھائی جاتی ہے اور کارٹون کے نام پر فحاشی بچوں کو دکھائی جاتی ہے۔ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: ما من مولود الا یولد علی الفطرة فأبواه یھوّدانه أو ینصّرانه أو یمجّسانه (بخاری: ۱۲۷۰) (ہر بچہ کی پیدائش فطرت یعنی اسلام پر ہوتی ہے لیکن اس کے والدین اسے یہودی، نصرانی یا مجوسی بنا دیتے ہیں)۔

اس حدیث کے معنی محدثین اور شارحین حدیث نے یہ بیان کیے ہیں کہ اگر یہودی کے گھر بچہ پیدا ہو تو وہ فطرت اسلام پر ہی رہتا ہے، اس کے اندر ابتداء میں اسلامی تعلیمات ہی اللہ رب العالمین کی طرف سے داخل کی جاتی ہیں، لیکن جیسے جیسے وہ بڑا ہوتا جاتا ہے اور اس کے یہودی والدین اسے یہودیت کی تعلیم دیتے رہتے ہیں تو بالآخر وہ بڑا ہو کر یہودی بن جاتا ہے۔ موجودہ دور میں ٹی وی اور ریڈیو کے ذریعے مسلمانوں کے بچے بھی ہندو، یہودی اور نصرانی بنتے جا رہے ہیں۔ وجہ صرف یہ ہے کہ والدین اپنے بچوں پر دھیان نہیں دیتے کہ ان کا بچہ کیا دیکھ اور سن رہا ہے اور بچہ بڑا ہونے کے بعد اگر کبھی مشکل میں آجاتا ہے تو وہی شرکیہ کام کرتا ہے، جو اس نے بچپن میں دیکھا اور سنا تھا۔

اسی طرح ٹی وی پر آنے والے پروگرامز کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ جب کوئی بچہ ٹی وی پر بچپن سے بتوں کی پوجا ہوتے دیکھتا آتا ہے تو بڑے ہونے کے بعد اسے بت پرستی دیکھ کر دل میں معمولی حرکت تک پیدا نہیں ہوتی، کوئی برائی محسوس نہیں کرتا۔ یہی وجہ ہے کہ بیشتر مسلمان اپنی دعوتی ذمے داری کو بھول چکے ہیں اور برائیوں کو دیکھ دیکھ کر سود اور شراب جیسی لعنت میں پڑے ہوئے ہیں۔

ایسے ماحول میں ضرورت ہے کہ مسلمان بھی اپنی دعوت عام کریں، اپنی حقیقی اور صاف و شفاف تصویر دنیا کے سامنے پیش کریں اور بہتان تراشیوں کا کھل کر جواب دیں، آپ کے ذہن میں آئے گا کہ ہم تو یہ سب کر ہی رہے ہیں- ہاں! ہم جواب بھی دے رہے ہیں، اسلام کی سچی تصویر پیش بھی کر رہے ہیں اور دعوت الی اللہ کا کام بھی جاری ہے۔ لیکن، کہاں؟ جمعہ کی تقریروں میں جہاں سامعین صرف مسلمان ہوتے ہیں؟ جلسہ اور اجتماعات میں جہاں مسلمانوں کے علاوہ کوئی نہیں آتا؟ اردو اخباروں اور مجلات میں، جنہیں عام انسان تو درکنار ہر مسلمان بھی نہیں پڑھ سکتا؟ ہماری مثال ایسی ہی ہے کہ انگریزی کے سوالیہ پرچہ کا جواب کوئی طالب علم دوسرے روز اردو کے جوابیہ پرچہ میں لکھ آئے گرچہ اس نے انگریزی کے پرچے میں کئے گئے سارے سوالات کا صحیح صحیح جواب لکھا ہو، لیکن اسے جہاں جواب دینا چاہیے تھا وہاں جواب نہیں دیا تو وہ کبھی کامیاب نہیں ہو گا۔ الزام ہم پر الیکٹرانک میڈیا لگاتا ہے اور ہم جواب اپنے اسلامی جلسوں اور اردو رسالوں اور مجلوں میں دیتے ہیں۔

اس بات سے مجھے کوئی انکار نہیں کہ جلسہ اور جلوس کا یقیناً فائدہ ہوتا ہے اور جوابات بھی جس طرح سے دیے جا رہے ہیں۔ ان سے مسلمانوں کو ضرور فائدہ ہوتا ہے اور کئی لوگ اپنے ملنے جلنے والے غیر مسلموں تک وہ جوابات پہنچا کر انہیں مطمئن بھی کر دیتے ہیں۔ لیکن لاتعداد افراد ایسے بھی ہیں، جن کا کوئی ملاقاتی مسلمان نہیں اور کئی ایسے مسلمان ہیں جن کا تعلق کئی غیر مسلموں سے ہے لیکن ان مسلمانوں کا تعلق اسلام سے نہیں بلکہ وہ اسلامی تعلیمات سے کوسوں دور ہیں۔ ایسے افراد تک اسلام کا پیغام پہنچانے کے لیے ہم نے کیا کیا؟ جن کے ذریعے اسلام کی غلط تصویر ٹی وی اور ریڈیو کے ذریعے پہنچائی جا رہی ہے، جسے دیکھنے اور سننے کے بعد تو کئی لوگ مسلمانوں سے ملنا جلنا بھی پسند نہیں کرتے۔ ایسے میں مسلمانوں کے اوپر یہ ذمے داری عائد ہوتی ہے کہ وہ میڈیا کی یلغار کا مقابلہ کرنے کے لیے جامع پالیسی تشکیل دیں۔ میڈیا سے وابستہ افراد کی فنی تربیت اور میڈیا کو عصر حاضر کے تقاضوں سے ہم آہنگ کرنے کے لیے ایسے معیاری میڈیا انسٹی ٹیوٹ قائم کرنے کی بھی ضرورت ہے، جو ایسے افراد تیار کر سکے، جو اسلامی تہذیب و ثقافت کو پروان چڑھانے میں اپنا کردار ادا کر سکیں۔ الیکٹرانک میڈیا کے میدان میں پیش رفت کے لیے موثر اور جامع حکمتِ عملی کی ضرورت ہے۔ اسلامی تحریکیں، میڈیا، ادارے اور مسلم تنظیمیں ہر سطح پر اس کے لیے بھرپور کردار ادا کر سکتی ہیں۔ مسلم دنیا اگر مجوزہ سفارشات اور خطوط پر منظم اور احسن انداز میں اقدامات کرے تو امت مسلمہ میڈیا کے محاذ پر درپیش چیلنج کا بھرپور اور موثر جواب دے سکے گی۔ مسلمانوں کو مغرب کی اندھی تقلید اور نقالی نہیں کرنی

چاہیے۔ٹی وی ڈراموں میں اسلامی تاریخ وثقافت کو پروان چڑھانا چاہیے۔اگر احساس زندہ ہو تو آج بھی مثبت اور تعمیری تفریح کو مسلم ممالک میں فروغ دیا جاسکتا ہے۔ تعمیری، اصلاحی، تاریخی اور معلوماتی پروگرام تیار کرنے کی ضرورت ہے۔ فلم کے میدان میں مصر، ایران اور ترکی نے خاصی ترقی کی ہے اور عالمی ایوارڈ بھی حاصل کیے ہیں۔ایسی فلمیں جو اصلاح و تطہیر کا فریضہ انجام دیں اور جن کے ذریعے اسلامی معاشرے میں تعلیم وتربیت کا عمل بڑھ سکے ان کو مسلم ممالک میں رواج دینے کی ضرورت ہے۔

مغرب کی یہ حکمت عملی رہی ہے کہ وہ امتِ مسلمہ کے جذبات کو آزمانے کے لیے پرنٹ و الیکٹرانک میڈیا میں مسائل اٹھاتا رہتا ہے، اسلامی شعائر کی توہین کی جاتی ہے، تو مسلم دنیا میں احتجاجی مظاہروں کے ذریعے ہی ردِ عمل سامنے آتا ہے۔ لیکن میڈیا کے ذریعے اس کا جواب نہیں دیا جاتا۔ مسلم دنیا کو الیکٹرانک میڈیا اور انٹرنیٹ پر اسلامی تشخص کو عام کرنے اور مغربی پروپیگنڈے کا موثر جواب دینے کے لیے اپنے دائرۂ کار اور کاوشوں کو موثر اور منظم انداز میں بڑھانے کی ضرورت ہے۔

مسلم ممالک اور مغرب میں موجود مسلم تنظیمیں بڑے محدود دائرے میں میڈیا کے شعبے میں کام کر رہی ہیں۔ مغرب نے جس سطح پر میڈیا سے کام لیا ہے، وہ مغربی ایجنڈا دنیا پر مسلط کرنے کے لیے خاصا کارگر ثابت ہوا ہے۔ مسلم تنظیموں، اداروں اور تحریکوں کے لیے بے حد ضروری ہے کہ میڈیا کے لیے مناسب بجٹ مختص کریں، الیکٹرانک میڈیا بالخصوص ٹی وی چینلوں کو ہدف بنا کر کام کیا جائے، پروڈکشن ہاؤس کے ذریعے اینکر پرسنز اور پروڈیوسرز کی تربیت کا بندوبست کیا جائے، آیندہ دس سال کا منظر نامہ سامنے رکھا جائے تو مسلم دنیا میں الیکٹرانک میڈیا میں ایسے افراد بڑی تعداد میں دستیاب ہو سکیں گے جو قومی اور دینی سوچ اور نظریاتی شناخت کے حامل ہوں گے۔

مسلم ممالک میں تنظیموں اور اداروں کو میڈیا تھنک ٹینک کا قیام عمل میں لانا چاہیے۔ایسے میڈیا تھنک ٹینک جو مغرب سے مکالمہ کر سکیں، امریکا اور یورپ کے میڈیا تھنک ٹینک اسلام مخالف پروپیگنڈے میں پیش پیش ہیں۔ میڈیا تھنک ٹینک کے ذریعے مغربی پروپیگنڈے کا توڑ کیا جاسکتا ہے اور حالات وواقعات کی اصل تصویر دنیا کے سامنے پیش کی جاسکتی ہے۔

مسلم دنیا کے اندر ذرائع ابلاغ کے منتظمین اپنی سطح پر محدود دائرے میں کام کر رہے ہیں لیکن مکمل معلومات نہ ہونے اور موثر حکمتِ عملی سے تہی دامن ہونے کی وجہ سے اس کے اثرات صحیح طور پر مرتب نہیں ہو رہے ہیں۔ مسلم ممالک کی تنظیموں، اداروں اور تحریکوں کے میڈیا سے متعلق افراد کے

نیٹ ورک کو منظم اور مربوط کرنے کی اشد ضرورت ہے، جس کے لیے انٹرنیشنل میڈیا کانفرنس کا انعقاد کیا جائے۔ اگر عالم اسلام کی میڈیا کانفرنس کا انعقاد ایک تسلسل سے ہو تو نہ صرف میڈیا کے میدان میں پیش رفت کا جائزہ لیا جاسکتا ہے بلکہ درپیش چیلنجوں کے لیے موثر حکمتِ عملی بھی تشکیل دی جاسکتی ہے۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ دنیا میں الیکٹرانک میڈیا اور انٹرنیٹ کی ٹکنالوجی پھیلنے سے مطالعے کا رجحان کم ہو گیا ہے۔ اب لوگ ٹی وی چینلوں اور انٹرنیٹ کے ذریعے معلومات اور تفریح حاصل کرتے ہیں۔ ہندستان سمیت مسلم دنیا کے لیے ناگزیر ہے کہ جدید ٹکنالوجی کے ذریعے دنیا بھر میں اسلام کے حقیقی پیغام کو عام کرے۔ اس مقصد کے حصول کے لیے جدید خطوط پر پروگراموں کی تیاری کے لیے پروڈکشن ہاؤس بنانے چاہئیں۔ اس کی ایک کامیاب مثال پیس ٹی وی کی ہے، جہاں سے نشر ہونے والے پروگرام ہندستان سمیت دنیا بھر میں بڑے پیمانے پر پھیل چکے ہیں۔ مختلف ممالک میں ایسے ٹی وی چینلوں کو قائم کرنے کی طرف توجہ دینے کی بھی ضرورت ہے جو معاشرے کی تعلیم و تربیت اور شعور و آگہی کو پروان چڑھا سکیں۔

امریکا اور یورپ میں الیکٹرانک میڈیا کے میدان میں جدید ٹکنالوجی کا استعمال بڑھتا جا رہا ہے۔ اب تو امریکا اور یورپ میں شہروں کی سطح پر حکومت اور این جی اوز کی سرپرستی میں پبلک براڈکاسٹنگ سنٹر بنائے جا رہے ہیں۔ ان ٹریننگ سنٹروں میں میڈیا سے دل چسپی رکھنے والے افراد کو اینکرنگ، پروڈیوسنگ، اسکرپٹ رائٹنگ، فوٹو گرافی اور ایڈیٹنگ کی تربیت دی جاتی ہے۔ اس تناظر میں ہندوستان سمیت مسلم ممالک میں ایسے پبلک براڈکاسٹنگ سنٹرز کا قیام ضروری ہے جہاں نشری تربیتی مراکز سے بہترین اینکر پرسنز، پروڈیوسرز اور دیگر باصلاحیت افراد تیار کیے جاسکیں، جو مسلم دنیا میں گہرے شعور و ادراک کے فروغ کے لیے کام کر سکیں۔

مغربی میڈیا کی جدید ٹکنالوجی کے بالمقابل اگرچہ عالم اسلام میں بھرپور پیش رفت نہیں ہو سکی ہے، لیکن سعودی عرب، کویت، قطر اور ترکی وغیرہ نے میڈیا کے میدان میں پیش رفت کی ہے۔ انٹرنیٹ اور ٹی وی چینلوں کے ذریعے اسلام کی دعوت احسن انداز میں پیش کی جا رہی ہے۔ تاہم مسلم ممالک میں جدید میڈیا ٹکنالوجی سے ابھی تک خاطر خواہ استفادہ نہیں کیا جا رہا ہے۔ الیکٹرانک میڈیا کے میدان میں پیش رفت کے لیے موثر اور جامع حکمتِ عملی کی ضرورت ہے۔ اسلامی تحریکیں، میڈیا ادارے اور مسلم تنظیمیں اس میں بھرپور کردار ادا کر سکتی ہیں۔

اخبار علمیہ

چنئی کے قریب ۱۲ہزار برس پر محیط چار تہذیبوں کے آثار ملے: چنئی کے مضافات میں رینالٹ نسان، آٹو موبائل فیکٹری سے ۵ کلو میٹر کے فاصلہ پر واقع ہے۔ جہاں تقریباً ۱۲ہزار سال پہلے کے پتھر کے ہتھیار واوزار بنانے والی ایک قدیم جگہ ملی ہے۔اس انکشاف پر یقین کرنے کی آرکیالوجیکل سروے آف انڈیا ٹیم کے پاس کئی وجہیں ہیں۔مزید یہ کہ ٹیم نے کم از کم چار تہذیبوں کی تہوں کوایک ہی گڈھے میں ہزاروں سال نہیں تو سیکڑوں سال الگ پایا۔وڈاکوپٹی گاؤں میں پائے جانے والی سب سے اہم دریافتوں کی میسولیتھک (میان حجری) دور کی کلہاڑی، کھرچنے والا آلہ، چھرا اور تانبہ شامل ہیں۔وہ سیکڑوں پتھروں کے ٹکڑوں کے ساتھ سطح سے صرف ۷۵ سنٹی میٹر نیچے تھے۔ماہر آثار قدیمہ (چینئی سرکل) اے آئی سپر نٹنڈنگ ایم کالی میتھو کا کہنا ہے کہ ایسا لگتا ہے کہ کسی جگہ قدیم لوگوں نے شکاریوں کے لیے پتھر کے اوزار بنائے تھے۔ماہرین آثار قدیمہ اسی 10m10m گڑھے میں اوپری تہہ میں سنگم دور (دوہزار سال پہلے) کے نوادرات خاص قسم کے برتن اور شیشے کے موتیوں کو دیکھ کر حیران رہ گئے جو روم کے ساتھ سرگرم اور فعال تجارت کی نشاندہی کرتے ہیں۔ان میں سونے کے زیورات، ٹیرا کوٹا کے کھلونے، موتیوں کی مالا، چوڑیوں کے ٹکڑے، برتنوں کے ٹکڑے اور سکے بھی شامل ہیں۔ سطح کے آس پاس کے علاقے میں ابتدائی پلاوا دور (۲۷۵عیسوی) سے لے کر آخری پلاواس (۸۹۷عیسوی) تک کے مجسمے دریافت ہوئے ہیں۔ریاستی محکمہ آثار قدیمہ سے وظیفہ یاب سری دھرن نے کہا کہ وڈاکوپٹو میں ہزاروں سالوں سے مسلسل رہائش کا پتہ چلتا ہے۔انہوں نے مزید کہا کہ یہاں بڑی تعداد میں لوگ رہتے تھے۔ محققین کا کہنا ہے کہ ان اوزاروں کی چھوٹی جسامت اور نفاست اس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ یہ بستی میسولیتھک دور کی ہے۔یہ بات بھی اہم ہے کہ کسی جگہ پر ٹیم کو سنگم دور سے تعلق رکھنے والی ہاتھ سے بنی چھتیں ملی ہیں۔سرید ھرن نے کہا کہ کیزہاڈی اور کوڈمنال جیسی جگہوں پر پائی جانے والی چیزوں سے مختلف ہیں۔دوسری دریافتوں میں پالوا دور کے مجسمے ریت کے پتھروں سے بنے تھے۔ ٹیم کو وشنو کے مجسمے اور ایک شیولنگ ملا جو قرون وسطیٰ کے دور کے ہیں اور وہاں ایک مندر کی موجودگی کا اشارہ کرتا ہے۔(ٹائمز آف انڈیا، وارانسی ایڈیشن، ۲۴ستمبر ۲۲ء ص ۱۴)

جرمن میوزیم میں قدیم ہندوستانی آرٹ ناگا ٹیٹوئسٹ کے کام کی نمائش: جرمنی کے سب سے بڑے اور یورپ کے سب سے نمایاں نوادرات اور ثقافت کے حامل میوزیم ہمبولڈ فورم نے ہفتے کے روز عوام کے لیے پر اپنے دروازے کھول دیے۔ جن میں بیش قیمت اور قرون وسطیٰ کے ہندوستانی مجموعوں اور شمال

مشرق کے مشہور ٹیٹوئسٹ موناگا کے کام کی نمائش کی گئی۔ ہندوستان میں دوسری اور تیسری صدی عیسوی کے بدھا اور بودھستوا کے مجسمے اور شاہجہاں کی ۱۷ویں صدی کی سنہری پرنٹنگ شامل ہے۔ برلن میوزیم "لوٹے گئے" نوآبادیاتی دور کے فن پاروں اور ان کی واپسی کے لیے شور مچانے کے سبب عالمی سطح پر ایک طوفان کی زد میں ہے۔ میوزیم کا مشرقی حصہ جرمنی کے سب سے مہنگے ثقافتی منصوبے ۶۷۹ ملین ڈالر کی لاگت سے تعمیر کیا گیا ہے۔ جس میں پہلے کے اتھنولوجیکل میوزیم اور میوزیم آف ایشین آرٹ کے مجموعے ہیں اور اس میں تقریباً بیس ہزار نمائشی اشیا ہیں۔ مستقل مجموعوں کے علاوہ ہمبولٹ چھ عارضی نمائشوں کا انعقاد کر رہا ہے اور شمالی مشرقی ہندوستان کی ناگا لینڈ وائسز ان میں سے ایک ہے۔ ہمبولٹ نے کہا کہ یہ نمائش عصری ناگا معاشرے اور اس کی ثقافتی شناخت کے پہلوؤں کو اجاگر کرتی ہے جس میں ایتھونولوجیکل میوزیم کے تاریخی ناگا مجموعہ کو عصری فوٹو گرافی کے فیشن اور علاقہ کے وژول (مرئی) آرٹ کے ساتھ جوڑ دیا گیا ہے۔ ٹیٹوئسٹ مورنگم کالنگ کا کام جو مورناگا کے نام سے مشہور ہے ناگا لینڈ نمائش کے حصے کے طور پر پیش کیا جائے گا۔ مو، ناگا آرٹسٹ ہیں۔ جو ٹیٹوز کی بحالی کا باعث بن رہے ہیں۔ ہم نے ان سے ذاتی طور پر رابطہ کیا۔ اتھنولوجیکل میوزیم کے کیوریٹر نے ٹائمز آف انڈیا کو بتایا کہ یہ نمائش ۲۰۲۴ء تک چلے گی۔ یہ نمائشیں ٹیٹو کو ایک مختلف نقطۂ نظر سے دیکھنے میں مدد کرتی ہیں۔ جرمنی کے پولوناگا قبیلہ سے تعلق رکھنے والے مو، کے نے ٹائمس آف انڈیا کو بتایا کہ دہلی میں برسوں تک ٹیٹوئسٹ کے طور پر کام کرنے کے بعد ٹیٹو گاؤں قائم کرنے کے لیے مین پوری آیا ہے جہاں وہ ہاتھ سے ٹیٹو بنانے کا روایتی فن سکھانے اور صدیوں پرانے ڈیزائنوں اور کہانیوں کو محفوظ رکھنے کا ارادہ رکھتا ہے۔ مو کو پختہ یقین ہے کہ نوادرات کو جس بھی طریقے سے یورپ لے جایا گیا تھا ایک وقت آئے گا جب وہ واپس آئیں گے۔ حالانکہ ان کی وطن واپسی ایک سست عمل ہے۔ (ٹائمز آف انڈیا، نئی دہلی، وارانسی ایڈیشن ۳۰ ستمبر ۲۲ء ص ۸) **ک، ص اصلاحی**

تخت طاؤس پر تاج محل کی دگنی لاگت آئی: مغل بادشاہ شاہجہاں (۱۵۹۲۔۱۶۶۶ء) کا دور ہندوستان کا سنہری دور تھا۔ اس نے فنون لطیفہ اور تعمیرات پر خصوصی توجہ دی اور دہلی میں ایک نیا شہر شاہجہان آباد بنایا۔ اس نے اپنی ملکہ کے لئے تاج محل کے نام سے مقبرہ بنایا جو ۱۶۳۲۔۱۶۵۳ء کے دوران اس وقت کے تین کروڑ بیس لاکھ روپئے (آج کے تقریباً ایک ہزار ملین امریکی ڈالر کے برابر) کی لاگت سے تیار ہوا۔ اس کی تیاری میں ۲۰ ہزار معماروں اور مزدوروں نے ۲۲ سال کام کیا۔ اس کو دنیا کے عجائب میں شمار کیا جاتا ہے۔ لیکن شاہجہاں کا سب سے یادگار اور مہنگا شاہکار تخت طاؤس تھا جس میں دنیا بھر سے

قیمتی پتھر لا کر لگائے گئے تھے۔اس کے چاروں عمودوں پر مور بنائے گئے تھےاور اسی وجہ سے اسے تخت طاؤس کا نام دیا گیا۔ان قیمتی پتھروں میں کوہ نور ہیرا اور تیمور نامی یاقوت شامل تھے۔ تخت طاؤس بنانے میں تاج محل سے دگنی لاگت آئی اور اس کو ۷ سال میں تیار کیا گیا۔ایک اندازے کے مطابق سنہ ۱۰۰۰ء۔۱۹۹۹ء کے درمیان، یعنی ایک ہزار سال کی مدت میں، تخت طاؤس سے مہنگا کوئی آرٹ کا شاہکار نہیں بنایا گیا۔۱۷۳۹ء میں نادر شاہ اپنے ہندوستان پر حملے کے دوران اس کو لوٹ کر ایران لے گیا جہاں اس کو توڑا گیا اور اس کے حصے شاہ ایران کے عرش بنانے کے لئے استعمال ہوئے۔۱۹۷۹ء کے اسلامی انقلاب کے بعد سے یہ عرش ایران کے مرکزی بینک میں رکھا ہوا ہے جبکہ اس کا سب سے قیمتی پتھر کوہ نور برطانوی تاج میں لگا ہوا ہے۔

("The Peacock Throne cost two times more than Taj Mahal", *Madras Courier*, 12 September 2022 – https://madrascourier.com/insight/the-peacock-throne-cost-two-times-more-than-taj-mahal-heres-why/)

(ڈاکٹر ظفرالاسلام خان)

آثارِ علمیہ وتاریخیہ

مکتوبات چند بہ نام علامہ سید سلیمان ندویؒ

کلیم صفات اصلاحی

مولانا سید ریاست علی ندوی مرحوم کے مسودات میں ان کی غیر مطبوعہ کتابوں اور مضامین کے ساتھ ان کے نام اہل خاندان اور بعض اکابر اہل علم کے درجنوں دلچسپ اور علمی خطوط ہیں۔ان خطوط کی علمی، ادبی، تاریخی افادیت سے کس کو انکار ہو سکتا ہے۔ان کی اسی اہمیت کے پیش نظر اس سے قبل ان کے نام بعض اہل علم کے خطوط معارف میں شائع کیے جا چکے ہیں اور آئندہ بھی یہ سلسلہ جاری رہے گا۔انشاء اللہ۔ موجودہ ناظم دارالمصنّفین کی جانب سے یہ ہدایت ہے کہ گاہے گاہے مولانا سید ریاست علی ندوی مرحوم کے غیر مطبوعہ مضامین اور علمی خطوط استفادہ کے مقصد سے معارف میں اشاعت کے لیے دیتے رہیں۔اس ذخیرۂ مکتوبات پر نگاہ ڈالنے کے دوران تین ایسے خطوط ابھی جلد ہی ہاتھ آئے جو علامہ سید سلیمان ندویؒ کے نام ہیں اور ایسے زمانہ میں لکھے گئے ہیں جب آزادی کا سورج طلوع ہونے والا تھا۔ایسے پر آشوب دور اور ہنگامی حالات میں بھی شیدایان اردو کا علم وادب سے رشتہ ٹوٹا نہیں تھا۔ان خطوط میں جو چیز سب سے زیادہ وجہ کشش ہے وہ دارالمصنّفین کے فضلا اور اس کی مطبوعات کا خاص طور سے علما و ادبا کی توجہ کا مرکز اور علمی و تحقیقی دنیا کا صحیح معنوں میں مرجع قرار پانا ہے۔پہلے خط سے ظاہر ہے کہ یہ مکتوب الیہ کے کسی خط کا جواب ہے۔اس سے اور بہت ساری معلومات کے ساتھ اس زمانہ میں کراچی میں اردو کے اثرات اور اس کی سرگرمیوں کا اندازہ ہوتا ہے۔دوسرے خط میں ابن جمعہ کی تصنیف ''تحریر الاحکام'' کی طباعت واشاعت کے سلسلہ میں کلکتہ کے ایک طالب علم کا استفسار ہے۔طالب علم سے ''ما''، ''کی'' وغیرہ کا صحیح استعمال نہیں ہو سکا تھا۔اس لیے کمپوزنگ کے دوران بریکٹ میں صحیح لکھ دیا گیا ہے۔ تیسرے خط میں مکتوب نگار نے سیرۃ النبیؐ، خلفائے راشدین، سیر الصحابہ کے موضوع پر مشتمل دارالمصنّفین سے شائع شدہ کتابوں کے سلسلہ میں مہتمم دارالمصنّفین سے معلومات طلب کی ہے اور آخر میں اس بات کا خاص طور پر اظہار کیا گیا ہے کہ دارالمصنّفین ہی ایک ایسا ادارہ ہے جو ان موضوعات پر مستند معلومات مہیا کر سکتا ہے۔اس سے اس زمانہ میں دارالمصنّفین کے علمی و تحقیقی اعتبار واستناد اور علمی حلقہ میں اس کی مقبولیت کا علم ہوتا ہے۔ **ک۔ ص اصلاحی**

مکتوب(۱)

از۔ جامع قادریہ سولجر بازار، کراچی نمبر ۳۔

۹/دسمبر ۴۶ء

مخدومی حضرت علامہ صاحب زاد مجدکم سلام مسنون

عرض آنکہ گرامی نامہ شرف صدور لایا۔ یاد فرمائی کا شکریہ

سندھ کی اردو کی تاریخی حیثیت سے آپ کما حقہ آشنا ہیں۔ ''پنجاب میں اردو''اور ''عرب وہند کے تعلقات'' سے بھی اس پر روشنی پڑتی ہے۔ ''سندھ اور ملتان اور عرب'' کی ثقافتی، تعلیمی، اسلامی تاریخی اہمیت اور آثار قدیمہ و بزرگان دین وملت، صوفیۂ کرام کے روحانی اثرات سے ان خطّوں میں اردو کے بنیادی اثرات سندھی، ملتانی، عربی، فارسی زبانوں کی باہمی آمیزش سے سندھ میں اردو کا جنم ہوا اور پھر ''سندھ''کو ہندوستان کی مختلف اسلامی اور تغلق، خلجی، مغلیہ حکومتوں کے ماتحت رہ کر عربی، فارسی کے ملاپ سے سندھی وہندی اثرات کی آمیزش سے اردو کا جامہ پہنایا گیا۔ سندھ کے قدیم علما، فضلا، صوفیہ، مؤرخین نے عربی، فارسی، سندھی کی یکساں سرپرستی کی۔ اسی طرح سندھی، ہندی زبانوں کی آمیزش نے ان سب زبانوں کے مشترکہ ملاپ سے یہاں اردو اثرات کے تاریخی مشاہدات پائے۔ پھر سندھی حکومتوں کے دور میں عربی، فارسی کو خاص اہمیت دی گئی۔ پھر ٹالپروں اور کلہوڑہ حکومتوں نے بھی اردو کی سرپرستی کی جس میں ''ریاست خیر پور میرس'' کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ ریاست کے دربار میں اردو کے شعرا کی سرپرستی کی گئی۔ میر علی نواز خاں ناز مرحوم سابق والی ریاست خیر پور نے ذاتی دلچسپی سے ''اردو'' کے لیے بہت کچھ کام کیا۔ ''خم کدۂ خیّام اردو'' آغا شاعر دہلوی مرحوم ناز ہی کے ایما پر طبع ہوا۔

''کراچی'' کی گذشتہ پچیس سالہ ترقی تمدنی، سیاسی، تجارتی اہمیت میں اضافہ ہونے پر سندھ کے مختلف سیاسی انقلابی اثرات نے یہاں مختلف افراد اور علم دوستوں کے ماحول سے ''اردو'' کو اپنانے کا ذریعہ مہیا کر دیا۔ یہاں مرکزی انجمن ترقی اردو کے ماتحت ''انجمن ترقی اردو'' کراچی کا قیام ہوا۔ جس کی سلور جوبلی منائی جاچکی ہے۔ ۸، مارچ ۱۹۴۰ء میں۔ اس کے بعد متعدد کانفرنسوں کا انعقاد ہوا۔ رفتہ رفتہ مونسپل مدارس کالجوں کے ذریعہ ''اردو'' زبان کو تقویت مل گئی ہے۔ یہاں اردو کے پانچ چھ اخبارات روزانہ وہفتہ وار نکل رہے ہیں۔ یہاں کے عام باشندے اردو سے مانوس ہیں۔ افسوس ہے کہ اب تک انجمن ترقی اردو، کراچی نے عمدہ لٹریری ادبی پروگرام کی اشاعت کے لیے کوئی قدم نہیں

اٹھایا۔ کانفرنسوں اور شاعروں کی سرگرمیوں سے علمی، لسانی، خالص ادبی فوائد جب تک حاصل نہ ہو سکیں گے۔ جب تک کراچی کے تمام علم دوست محبان اردو اور ادبا، شعرا، اہل قلم حضرات کا تعاون حاصل نہ کیا جائے اور پھر مشکل تو یہ ہے۔ یہاں کی حکومت سندھی نواز ہے۔ سرکاری طور پر اردو کی لٹریری حوصلہ افزائی نہیں کی جا سکتی۔ اس کے لیے انجمن کو کام کرنا ہے۔ مجھ ناچیز نے اپنے موروثی بزرگوں کی سنت کو زندہ رکھنے کے لیے چند سالوں سے علمی وادبی اور اردو کی خدمت کا خاموشانہ کام شروع کیا۔ میرے جد امجد قبلہ نے کراچی میں سب سے پہلے ''مدرستہ العلمیہ اسلامیہ'' کی بنیاد ڈالی اور خاص طور پر قرآنی تعلیم قرأت و تجوید کا ایک ادارہ قائم کیا۔ آپ ''دارالرشاد'' پتر جھنڈا گاٹھ کے ممتحن اعلیٰ بھی تھے۔ اور مکہ معظمہ میں حضرت حاجی امداد اللہ صاحب سے شرف صحبت پا چکے تھے۔ مولانا عبیداللہ سندھی مرحوم کے آپ سے تعلقات تھے اور حضرت مولانا خیر الدین صاحب دہلوی مولانا آزاد کے والد بزرگ و برادر ابوالنصر آہ دہلوی کے ملنے والوں میں سے تھے۔ میرا خاندان کراچی میں ایک صدی سے علمی، مذہبی، روحانی، قومی، ملی خدمات انجام دے رہا ہے۔ کراچی میں اردو کے لسانی، علمی، ادبی ارتقا میں میرے خاندان کا بہت بڑا ہاتھ ہے۔ میری مختصر کتاب ''اقبالؒ کی خودی'' چھپ چکی ہے۔ اب ''عرفان اقبالؒ اور افادات نیازی''، ''مرزا غالب کے ہم عصر اور زندہ دل قلندر'' چھپیں گی۔ امید کہ ان اشارات سے آپ اپنے گراں قدر استفادہ کا موقعہ عنایت فرمائیں گے۔

والسلام

مخلص

بشیر مخفی القادری، کراچی

مکتوب (۲)

بیٹک خانہ روڈ، کرمیلل ہاسٹل۔ کلکتہ

مؤرخہ ۲-۱۱-۷۴ء

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

حضرت علامہ، ایک ناچیز خادم دعاؤں کا محتاج

مرحوم خدا بخش کی تصنیف ''اسلام میں سیاست'' Politics in Islam کے مطالعہ کی (کے) وقت اس کی (کے) صفحہ نمبر ۲۱۹ میں ابن جمعہ کی (کا) ایک قلمی نسخہ ''تحریر الاحکام'' کے (کا) حوالہ نظر سے گذرا۔ لیکن مرحوم نے یہ نسخہ کہاں دیکھا کوئی پتہ نہیں دیا۔

ذیل کے سؤالات کے جواب قبلہ سے بڑھ کر اور کون دے سکیں گے ؟

(۱) ابن جمعہ کون ہے ؟۔(۲) اس کی پوری حالت کہاں دستیاب ہو سکتا (سکتی) ہے ؟ (۳) کیا اس کی یہ کتاب ''تحریر الاحکام'' کہیں چھپ بھی گیا (گئی ہے) ؟۔(۴) اس کی (کا) قلمی نسخہ یورپ یا ہندوستان کے کس کتب خانہ میں موجود ہے ؟۔

یہ ناچیز خادم کلکتہ یونیورسٹی میں آئندہ ۱۲ دسمبر کو اسلامی تاریخ و تمدن کے پرچہ میں ایم اے امتحان میں شریک ہونے والا ہے اور اسکی (کے) بعد ہی قانون کا امتحان۔ خادم کے پاس کچھ نہیں صرف رب العالمین پر بھروسہ اور حضور قبلہ کی دعاء مستجاب کی آرزو۔ کیا میری امید پوری ہو گی؟ جواب کے لیے ڈاک ٹکٹ ارسال خدمت ہے۔ والسلام

ناچیز خادم
محمد عبدالعلیم غفرلہ

مکتوب (۳)

از۔ نوشہرہ صدر، ضلع پشاور، صوبہ سرحد
محترم مہتمم دارالمصنّفین، اعظم گڑھ
السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

سیرت النبیؐ کا پہلا حصہ میری نظر سے گذرا۔ اس وقت "خلفائے راشدین" زیر مطالعہ ہے۔ دوران مطالعہ میں خیال آیا کہ چند ضروری کتابیں جو حال ہی میں آپ کے یہاں سے شائع ہوئی (ہوئیں) اور بدقسمتی سے ان میں سے کسی کا نام مجھے معلوم نہیں۔ ایک اشتہار نظر سے گذرا لیکن اب ڈھونڈنے پر نہیں مل سکا۔ ان کتابوں کا نام معلوم کرنا ضروری ہے۔ اس لیے مجبوراً براہ راست خط لکھ رہا ہوں۔ امید کہ میرے استفسارات کا مفصل جواب تحریر فرمادیں گے۔ سؤالات نمبروار ذیل میں درج کرتا ہوں۔

(۱) سیرت النبی کے کل حصے کتنے شائع ہوئے ہیں۔ مکمل ہو چکی ہے یا کچھ باقی ہے (۲) صحابی اور صحابیات کی ترتیب وار فہرست کیا ہے (۳) امام حسینؓ کے متعلق مفصل اور جامع کتاب آپ کے یہاں سے شائع ہوئی ہے یا نہیں۔ اگر ہے تو نام کیا ہے اور کتنے حصے ہیں (۴) خلفائے راشدین کے بعد جو خلیفے ہوئے ان کی ترتیب وار کوئی تاریخ مل سکتی ہے جس میں سلسلہ وار تسلسل موجود ہو۔ (۵) بنو امیہ اور بنو عباسیہ کی مکمل تاریخ میرے استفسارات نمبر ۴ میں ہی موجود ہو گی یا ان کا سلسلہ الگ ہے (۶) سلسلۂ خلافت کہاں ٹوٹا اور اس کے بعد کے حالات کس کتاب میں وضاحت کے ساتھ مل سکتے ہیں (۷) ہسپانیہ، سپین اور اندلس وغیرہ ان علاقوں کی اسلامی تاریخ مفصل اور جامع کسی نام سے شائع ہوئی ہے یا

نہیں (۸) کیا یہ تمام کتابیں براہ راست آپ کے یہاں سے دستیاب ہوسکتی ہیں یا الگ الگ پتے پر ملیں گی۔

امید ہے کہ مفصل جواب سے مطلع فرمادیں گے۔ ا/پیسہ کے (کا) ٹکٹ ہمراہ ارسال ہیں (ہے)۔ مدت سے یہ خواہش ہے کہ اسلام کی پوری تاریخ کا ذخیرہ مطالعہ کرسکوں۔ مگر مختلف قسم اور مختلف مؤلفوں کی کتابیں ہیں جس میں بعضے سراسر لغو باتوں سے بھری پڑی ہیں۔ آپ کا ادارہ ہی ایک ایسا ادارہ ہے جہاں سے صحیح معلومات مہیا ہوسکتی ہیں۔ امید کہ میری تشفی ہوجائے گی۔

مرزا سعید احمد پسر مرزا عبدالمجید مرحوم

مضمون نگاروں کے لئے اعلان

۱۔ مضمون صرف ورڈ MS Word پروگرام میں، جمیل نوری نستعلیق فانٹ، پوائنٹ ۱۵ میں بذریعہ ایمیل بھیجیں۔ ایمیل کا پتہ: info@shibliacademy.org

۲۔ اگر مضمون مخطوطہ حالت میں دستی یا ڈاک سے بھیجا جارہا ہے تو براہ کرم کاغذ کے صرف ایک طرف اچھا حاشیہ چھوڑ کر لکھیں اور مضمون کی ایک کاپی اپنے پاس ضرور محفوظ رکھیں۔

۳۔ ہر صفحے کے حوالہ جات اسی صفحے پر نیچے حاشیے پر نمبروار لکھیں۔

۴۔ آسان اور عام فہم زبان استعمال کریں۔

۵۔ حوالے اس ترتیب سے ہوں: مصنف، کتاب کا نام، ناشر، جگہ، سال، جلد (اگر ایک سے زیادہ جلد ہو)، ایڈیشن (اگر طبع اول کے بعد کا ایڈیشن ہو)، صفحہ، صفحات۔

۶۔ مضمون A4 سائز کے ۶۔۲۰ صفحات کے درمیان ہو اور ہر مضمون اپنی جگہ مکمل ہو۔

۷۔ معارف میں حتی الامکان سلسلہ وار مضامین نہیں شائع کئے جائیں گے۔

۸۔ معارف میں صرف غیر مطبوعہ مضامین ومقالات کو جگہ دی جائے گی۔ کہیں اور چھپنے کے لئے بھیجا گیا مضمون قابل قبول نہیں ہوگا۔

۹۔ نئے مضمون نگار اپنے مضامین کو معارف بھیجنے سے پہلے اپنے اساتذہ یا معتبر اہل علم کو دکھالیں۔

۱۰۔ نئے مضمون نگار اپنے مضمون کے ساتھ اپنی مختصر کوائف نیز پورا پتہ بشمول موبائل اور ایمیل پتہ بھی بھیجیں۔

۱۱۔ ہر مقالے کے ساتھ یہ وضاحت ہو کہ یہ مقالہ پہلے کہیں نہیں چھپا ہے اور اسے چھپنے کے لئے کہیں اور نہیں بھیجا جارہا ہے۔

تبصرۂ کتب

جدید اردو صحافت کا معمار، قومی آواز : از جناب سہیل انجم، متوسط تقطیع ،عمدہ کاغذ و طباعت ، صفحات ۲۸۸، قیمت ۴۰۰ روپے، پتہ: مولانا انجم فاؤنڈیشن ۰۷ ۶/۳/ اے،ذاکر نگر، نئی دہلی ۲۵ اور ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، ایچ، او،۱۶/ڈی-۱،انصاری روڈ، دریا گنج، نئی دہلی-۲، سن اشاعت ۲۰۲۲ء، موبائل ۹۲۱۰۳۴۶۷۷۸،ای میل:info@ephbooks.com

عہد رفتہ ابھی قصہ پارینہ نہیں ہوا لیکن قومی آواز جیسے اخبار کی باتیں واقعی ایسی ہیں جن کا ماضی، قریب ہوتے ہوئے بھی بہت بعید لگتا ہے۔ لکھنؤ شہر کی شان آثار و باقیات اور جن ترقیات سے تھی اس میں قومی آواز کی بھی بڑی اہمیت تھی۔ قیصر باغ تاریخی جگہ ہے، اسی قیصر باغ میں قومی آواز کی عمارت جدید اردو صحافت کی جلوہ گاہ تھی۔ حیات اللہ انصاری کی گویا پوری حیات قومی آواز کو زندگی دینے میں تمام ہوئی لیکن ان کے کارواں میں اردو کے ممتاز صحافیوں کی موجودگی، کسی کہکشاں کی طرح روشنی بکھیرتی رہتی۔ کیا اخبار تھا کہ عالم ہو یا عامی، صبح کی پہلی پہلی کرنوں کی طرح قومی آواز سے راحت سب کو یکساں ملتی۔ ہر پڑھے لکھے گھر میں قومی آواز کا ہونا گویا سماجی عزت کا اعلان تھا۔ قومی آواز کی اشاعت بند ہوئی تو اردو دنیا سوگوار ہو گئی۔ اس غم کی وجہ بھی تھی کہ اخبارات تو شائع ہوتے رہیں گے۔ صحافت کی تیز رفتار زندگی نئے مقامات کی سیر بھی کرائے گی لیکن قومی آواز کی لکھنوی شرافت و نفاست کو لوگ ترستے ہی رہیں گے اور نئی نسل اس کو تو شاید خبر بھی نہ ہو گی کہ کیا سرمایہ تھا جو نذر نسیاں ہو گیا۔ نام نیک رفتگاں کو ضائع نہ کرنے کی نصیحت صرف اشخاص ہی کے لیے خاص نہیں، آثار اور علامات کے لیے بھی ہے۔ شاید اسی احساس نے ایک صحافی ہی کو آمادہ کیا کہ وہ داستان قومی آواز سنائیں تاکہ داستان کے لطف بلکہ درد میں صداقت و واقعیت کی کمی نہ رہے۔ حق یہ ہے کہ یہ فریضہ فاضل مصنف نے بخوبی انجام دیا۔ صرف لکھنؤ ہی نہیں، دوسرے شہروں کی قومی آواز کی اشاعت کو بھی اس کاوش میں شریک کر لیا۔ ان کے کام کا آغاز اس احساس سے ہوا کہ قومی آواز کی مقبولیت اور وقعت کا یہ عالم تھا کہ اگر کسی کی دو سطریں ہی اخبار میں چھپ جاتیں تو وہ خود کو خوش قسمت تصور کرتا۔ قومی آواز کو ہر دل کی آواز بنانے والے صحافیوں پر مفصل اور معلومات افزا تحریر نے اس کتاب کو اور بھی معتبر اور موقر بنا دیا۔ عشرت علی صدیقی، عثمان غنی، عالم نقوی، حسین امین، مفتی رضا انصاری، مسیح الحسن، عبدالمجیب سہالوی، احمد جمال پاشا، مشتاق پردیسی، منظر سلیم، حسین قدوائی، کیسوں کیسوں کے فسانے اس بہانے یاد آ گئے۔ نافع قدوائی بھی جو جواں مرگی کا شکار ہوئے، ان کو سید عبدالنافع لکھا گیا ہے جب کہ وہ نافع قدوائی ہی لکھتے

تھے۔ مصنف خود عرصہ تک قومی آواز سے وابستہ رہے۔انہوں نے اس تعلق سے اپنی یادوں کی دنیا کی سیر کرادی۔اس سیر میں وہ بہت سی کام کی باتیں بھی کر گئے، جیسے کمپیوٹر انٹرنیٹ کی مفید ترقی اپنی جگہ لیکن منفی پہلو یہ ہے کہ اب استادی شاگردی کی روایت تقریباً ختم ہوگئی۔ نوآموز صحافی دوسری ویب سائٹوں سے سرقہ کرنے میں ماہر ہیں۔پروف ریڈنگ کی روایت بھی ختم ہو چلی ہے، گوگل ٹرانسلیشن کی سہولت ہے لیکن وہ کامل طور پر اعتبار کے قابل نہیں۔اسی لیے ایک اخبار نے سرجیکل اسٹرائک کا ترجمہ جراحی ہڑتال سے کردیا۔اس کے بالمقابل انہوں نے طبقہ کاتبان کی بھی تصویر پیش کی۔ جلال الدین اسلم اس طبقہ کے سرخیل ہیں۔ان کے بارے میں لکھا کہ بعض اوقات سرخی میں ایسی ڈیزائننگ کردیتے کہ اس میں خبر کا پورا مفہوم آجاتا۔ عشرت صدیقی تو خط اور حلیہ دیکھ کر کاتبوں کا تعین کرتے۔یعنی خط اچھا ہو اور حلیہ مسلمانوں جیسا ہو۔حیات اللہ انصاری کے متعلق کہا گیا کہ ان کی ادارت میں قومی آواز نے غیر جانب دار اور معروضی صحافت کی ایسی داغ بیل ڈالی جو اس سے قبل عنقا تھی۔یہ جملہ بھی خوب ہے کہ حیات اللہ انصاری کا نام صحافت کے لیے حیات آفریں استعارہ بن گیا۔قریب تمام مدیروں کے حالات بھی دیے گئے ہیں۔ کالم اور کالم نگاروں کا ذکر ہے لیکن ایک اہم گوشہ رہ گیا۔یہ کھیلوں کی دنیا کے تعلق سے ہے۔آزاد ہند کی طرح قومی آواز نے کھیل کی خبروں اور ان سے متعلق قصوں کو جس طرح پیش کیا وہ شاید بڑے بڑے انگریزی اخباروں کو بھی نصیب نہیں ہوا۔اگر اس زاویہ سے قومی آواز کو دیکھا جاتا تو ایک نام صغیر احمد رحمان کا ہے جن کے سب سے بڑے مداح اور قدرداں عشرت صدیقی اور عثمان غنی تھے۔رحمان دریاباد کے تھے اور ان میں تھے جن کی دوستی پر دل وجان سب قربان کیے جاسکتے ہیں۔ قومی آواز کی یادوں کو زندہ کرنے اور مستقبل میں اردو صحافت کے لیے ایک نمونہ پیش کرنے پر لائق مصنف کو دل سے مبارک باد۔(ع۔ص)

مسلم سائنس داں اور ان کے سائنسی کارنامے : از جناب محمد سراج الدین ، متوسط تقطیع ، عمدہ کاغذ وطباعت ، صفحات ۱۵۰، قیمت ۲۰۰ روپے، پتہ : کرناٹک اردو اکیڈمی ، نمبرA-۴۸، فرسٹ فلور، سعادت حج ہاؤس، ریچمنڈ روڈ، ریچمنڈ ٹاؤن، بنگلورو-۵۶۰۰۲۵، موبائل:۹۸۸۶۷۰۱۳۸۔

فلکیات، موسیقی، فلسفہ، طب، جغرافیہ، زراعت، تاریخ، سماجیات، سیاحت، ریاضی وغیرہ علوم کے شعبوں میں مسلمانوں کے کارنامے بیان کیے جاتے ہیں۔یہ کتاب بھی اسی عظمت رفتہ کو یاد کرنے اور اس سے کچھ سبق لینے اور کچھ بیدار ہونے کے لیے مرتب کی گئی۔مولف نے بتایا کہ دنیا کے مشہور سائنس دانوں پر یورپ کی کوئی کتاب دیکھیں تو ارسطو، ارشمیدس، گٹن برگ، کوپرنکس کا تذکرہ تو ملے گا

لیکن دوسو سال قبل مسیح سے سولہویں صدی عیسوی کے کسی مشہور سائنس داں کا نام نظر نہیں آئے گا۔اس دور میں سائنسی انکشافات وایجادات کا ذکر ہی نہیں۔اس لیے وسط ایشیا اور اسپین تک سے خاموشی اختیار کی گئی۔وجہ ظاہر ہے کہ اٹھارہ سو سال تک کوئی عیسائی یا یہودی سائنس داں کہلانے کے قابل ہی نہیں تھا۔اس کے بعد فاضل مصنف نے مسلمان سائنس دانوں کے کارناموں، ان کی افادیت اور ان سے مغرب کے استفادہ کے ساتھ ان کے کارناموں کے اظہار میں عصبیت بلکہ نفرت کا بہترین نقشہ پیش کر دیا۔مولف صاحب علم وفن ہیں۔محض ادھر ادھر سے معلومات جمع کر کے ان کو پیش نہیں کرتے۔اس کتاب سے اصل مصادر تک ان کی رسائی اور ان کی تحقیق کا اندازہ ہوتا ہے۔محنت نے اس کتاب کو قدر کے لائق بنا دیا ہے۔خصوصاً نئی نسل کو اپنے عظیم اور قابل فخر اسلاف کی علمی فتوحات سے واقف ہونے اور ان کی قدر کرنے کا جذبہ اس کتاب سے پیدا ہو سکتا ہے۔کتاب میں اکثر سائنس دانوں کی تصویریں ہیں اور ایک اچھا کام یہ بھی ہوا کہ ان سائنس دانوں کے ناموں کو جس طرح انگریزی میں لکھا جاتا ہے اس کو بھی درج کر دیا ہے۔ساتھ ہی تاریخی ترتیب بھی دے دی گئی۔یقیناً یہ کارآمد کتاب ہے۔مصنف کو ایک نہایت اچھے کام کے لیے تحسین و تبریک کا تحفہ پیش کیا جانا چاہیے۔(ع۔ص)

پہلی جنگ آزادی (۱۸۵۷ء) میں اردو زبان کا کردار: ڈاکٹر امام اعظم۔کاغذ و طباعت عمدہ، مجلد مع خوبصورت گرد پوش۔صفحات :۲۷۲۔ملنے کا پتہ: تمثیل نو پبلی کیشنز، محلہ گنگوارہ، پوسٹ سارا موہن پور، دربھنگہ (بہار)۔قیمت ۳۰۰ روپے۔سن طباعت: ۲۰۲۰ء موبائل نمبر: ۸۹۰۲۴۹۶۵۴۵۔ای میل: imamazam96@gmail.com

۲۰۰۷ء میں پہلی جنگ آزادی کے ڈیڑھ سو برس مکمل ہونے پر پورے ملک میں تقریبات کے سلسلے میں مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کے ریجنل سنٹر نے قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی کے اشتراک سے دربھنگہ میں ۲۸-۲۹ مارچ ۲۰۰۷ء کو دو روزہ قومی سیمینار منعقد کیا تھا۔جس میں پڑھے گئے مقالات کا یہ مجموعہ ہے۔مؤلف نے تقریباً ۱۳ برس بعد اہتمام سے اس کو شائع کیا ہے۔ان کے بقول اس میں کل ۳۷ مقالات پڑھے گئے تھے لیکن بعض مقالات کی عدیم الوصولی کے سبب اس میں ۲۸ مقالات ہی شامل ہیں۔(ص ۳۲)۔پیش لفظ میں اس سیمینار کے موضوع و مقصد پر عمدہ اور تاریخی گفتگو کی گئی ہے۔شرکائے سیمینار اور ان کے مقالات کے جامع تعارف نے کتاب کی قدر و قیمت میں اضافہ کر دیا ہے۔بہادر شاہ ظفر: پہلی جنگ آزادی کے حوالہ سے، طویل نظم کو مؤلف نے پہلا منظوم مقالہ قرار دیا ہے۔(ص ۳۲) جنگ آزادی میں بہار کا حصہ نئی معلومات کا حامل

ہے۔غالب:۱۸۵۷ء کے چشم دید،پہلی جنگ آزادی کا تحریکی ادب،پہلی جنگ آزادی سے متعلق دستاویزات،پہلی جنگ آزادی کا شعری ادب،تحریک آزادی میں اردو زبان کا کردار،پہلی جنگ آزادی اور دہلی کے اہم اخبارات،(اردو صحافت۔۔۔)،۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں انگریزوں کی تحریریں،۱۸۵۷ء کا صحافتی رجحان،کیا ۱۸۵۷ء کی جدوجہد پہلی جنگ آزادی تھی؟ایسے مقالات ہیں جو پڑھنے سے تعلق رکھتے ہیں۔مؤلف کی زبان ادبی اور اسلوب سادہ و دل نشین ہے۔ان کا یہ کام بڑا وقیع اور دستاویزی نوعیت کا ہے۔مؤلف نے اس سیمینار و تالیف کا مقصد بجا طور پر قومی شعور کو بیدار کرنا اور اسلاف کے کارناموں سے نئی نسل کو واقف کرانا بتایا ہے۔(ص ۱۳)

امام اعظم صاحب کی علمی و تصنیفی خدمات کو خاصی شہرت اور مقبولیت حاصل ہے۔مسلسل انہماک اور تجربہ نے بلاشبہ انہیں اچھے مصنف اور تنقید نگار کے مقام پر فائز کر دیا ہے۔یہی وجہ ہے کہ ان کے فن،شخصیت اور علمی خدمات پر متعدد کتابیں بھی منظر عام پر آچکی ہیں۔جو مقالات شامل اشاعت ہیں ان میں زیادہ تر ہندوستان کی معروف و مشہور یونیورسٹیوں سے وابستہ پروفیسر اور ڈاکٹر کے ہیں اور اپنے موضوع پر بھرپور،دلچسپ اور ادیبانہ رنگ و آہنگ کے حامل ہیں مگر بعض تحقیقی مقالات میں حوالوں کے اندراج کا جو اہتمام ہونا چاہئے تھا وہ نظر نہیں آیا۔ویرانے کو کیا گذری؟(ص ۳۹)،بارپرسی (ص ۴۸)اور اول العزم (۵۶)جیسی غلطیاں بھی راہ پاگئی ہیں۔

یہ مسئلہ شروع سے محققین کے درمیان مختلف فیہ رہا ہے کہ انگریزوں کے خلاف ۱۷۵۴ء کلکتہ، ۱۷۵۷ء پلاسی،۱۷۶۳ء بکسر،۱۷۹۹ء سرنگا پٹنم یا پھر ۱۸۵۷ء میں بہادر شاہ ظفر کی قیادت میں لڑی جانے والی جنگوں میں سے کس کو پہلی جنگ آزادی قرار دیا جائے۔اس سیمینار کی سب سے خاص اور اہم بات یہ ہے کہ شرکائے سیمینار ۱۸۵۷ء کی جنگ کو پہلی جنگ آزادی قرار دیے جانے پر متفق ہوئے ہیں۔مؤلف کے مطابق ''اس قومی سیمینار میں تصویروں کی زبانی،مفکرین کے ذریعہ،سیاست دانوں کے توسط سے،ملک گیر ادبی شخصیتوں کی شرکت اور پاکستان کے عظیم شاعر احمد فراز کی موجودگی کے حوالہ سے یہ بتایا گیا کہ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی ہی آزادی کی پہلی جنگ تھی''۔(ص ۱۱)

علاقہ کڈپہ کے نایاب تاریخی کتبے: ڈاکٹر راہی فدائی۔ کاغذ و طباعت عمدہ ، غیر مجلد مع خوبصورت گرد پوش، صفحات ۱۰۴، ملنے کا پتہ:الانصار پبلی کیشنز ا ے/۱۲/۲۲۳-۸-۱۸،ریاست نگر،حیدرآباد۔۵۰۰۰۵۹ قیمت :۱۰۰روپے۔ سن طباعت :۲۰۱۹ء۔موبائل نمبر: ۰۹۳۹۱۳۰۱۱۹۲۔ای میل: qaziasadsanai@gmai.com

جنوب ہند کے مشہور و معروف شہر کڈپہ کی علمی،ادبی بالخصوص اس کی سیاسی تاریخ سے دیار پورب کے اہل

علم کو کم ہی واقفیت ہے۔گذشتہ چند برسوں سے اس علاقہ کے جن اردو محققین نے اپنی مختلف النوع علمی،ادبی اور تحقیقی سرگرمیوں سے اس کے دائرۂ تعارف کو وسعت بخشی ہے ان میں اہم نام ڈاکٹر راہی فدائی صاحب کا ہے۔کڈپہ کی تاریخ پر ان کی خاص نظر ہے۔اس سے قبل "کڈپہ میں اردو" نام سے ان کی کتاب منظر عام پر آئی اور ہاتھوں ہاتھ لی گئی۔اس کا دوسرا ایڈیشن ۲۰۱۳ء میں شائع ہوا۔زیر نظر کتاب میں انہوں نے کڈپہ کی مسجدوں اور مزارات کے تقریباً ۲۵ تاریخی کتبات کو موضوع بنا کر کتبہ شناسی کی اپنی الگ علمی و تحقیقی صلاحیت کا ثبوت فراہم کیا ہے۔ان کتبات پر مرقوم اشعار کی قرأت اور مرور زمانہ کے سبب محو شدہ عبارتوں اور حروف کی شناخت،ان کی تفصیلات کی جمع و ترتیب اور ان کو تاریخی ترتیب کے ساتھ پیش کرنے پر انہوں نے دس برس کا عرصہ صرف کیا ہے۔(ص ۱۵) بعض قدیم مساجد کی توسیع کے سبب ضائع ہونے والے کتبات کی تفصیل ماضی کے اہل قلم کے مخطوطات سے نقل کی ہے۔مصنف نے پہلے مقدمہ میں کڈپہ کی وجہ تسمیہ اور ابتدا سے انگریزوں کی عمل داری کے زمانہ ۱۸۰۰ء تک اس کی سیاسی تاریخ اس طرح پیش کی ہے کہ اس علاقہ میں مسلمانوں کے عہد حکومت کا مختصر تذکرہ آگیا ہے۔ان معلومات کے لیے انہوں نے عربی،انگریزی،فارسی اور اردو کی ۴۰ مستند مطبوعات و مخطوطات کا حوالہ دیا ہے۔ڈسٹرکٹ گزٹ کے استعمال نے اس کے استناد میں مزید اضافہ کر دیا ہے۔آخر میں عکس تحقیق کے عنوان سے بعض اہم کتبات کی تصویریں بھی دی گئی ہیں۔ان کتبات کے متعلق معلومات کے اندراج کا یہ طریقہ اپنایا ہے کہ پہلے کتبہ کی عبارت نقل کی ہے۔اس کے بعد اس کا ترجمہ و تشریح اور آخر میں اس کا پس منظر بھی تحریر کیا ہے۔ص ۳۴ پر کتبہ مسجد اسحق اور ص ۸۱ پر کتبہ لوح مزار شہدائے کڈپہ کے علاوہ تقریباً ہر کتبہ کی عبارت فارسی و اردو اشعار پر مشتمل ہے۔ص ۳۵ پر کتبہ مسجد محمد داروغۂ بادشاہی،سدھوسوٹ پر لکھے گئے اشعار میں پہلے شعر کا پہلا مصرعہ نہیں ہے۔اس مسجد کی تعمیر کے پس منظر کے متعلق مصنف لکھتے ہیں کہ "یہ مسجد بادشاہی داروغہ جناب سید محمد نے بنوائی تھی اور یہ قلعے کے مشرقی دروازے کے روبہ رو واقع ہے۔اس مسجد کی تعمیر کے دور میں سدھوسوٹ نواب ذوالفقار علی خاں کے زیر اقتدار تھا۔اس دور میں سدھوسوٹ باغوں،حوضوں اور فواروں سے آراستہ خوبصورت شہر تھا۔جہاں ہر محلہ میں مسجدیں مصلیوں سے آباد رہتی تھیں"۔(ص ۳۶)۔

مصنف محترم کہنہ مشق اہل قلم ہیں۔انہوں نے اس مختصر مگر مفید کتاب کے ذریعہ بلاشبہ کڈپہ کی سیاسی،ادبی و ثقافتی تاریخ کو محفوظ کرنے کا فرض بخوبی نبھایا ہے۔اس علمی خدمت کے لیے وہ ذوق شناسان ادب و تاریخ کے شکریہ کے مستحق ہیں۔**ک ص اصلاحی**

وفیات

جناب اصغر عباس مرحوم (۱۹۴۲ء۔۲۰۲۲ء)

نہایت افسوس اور غم کا عالم ہے کہ ادھر ملک وملت کے سرمایۂ علم ودانش کی چمک دمک تیزی سے کم ہوتی جاتی ہے اور شور ماتم ہے کہ بڑھتا جاتا ہے۔

گذشتہ شمارہ میں جناب اصغر عباس کی وفات کی خبر تھی، مرحوم کو شہرت وشناخت دونوں شہر سرسید کے تعلق سے ملی۔ گوشہ گیر ہو کر اپنی دنیا خود بنانے اور آباد کرنے کا سلیقہ جن خوش نصیبوں کو عطا ہوتا رہا ہے ان میں مرحوم کا نام لبوں پر بے اختیار آجاتا ہے۔

سرسید اور علی گڑھ کا ذکر ان کی علمی وتحقیقی زندگی کا سب سے بڑا عنوان ہے اور اسی کے ذیل میں فکر مزاج، منہج اور مقصد سے وفاداری کے خدا جانے کتنے جلوے بکھرے نظر آتے ہیں۔

اصغر عباس کا وطنی تعلق مشرقی یوپی سے تھا، پہلے اعظم گڑھ اور اب مئو کی ایک نیک نام بستی بی بی پور میں وہ پیدا ہوئے۔ بی بی پور کے شیوخ کے بارے میں اعظم گڑھ گزیٹئر کے مرتب ایچ آر نیول نے لکھا تھا کہ یہ شیوخ حضرت ابوایوب انصاریؓ سے نسبی سلسلہ رکھتے ہیں، اسی گزیٹئر میں اصغر عباس کے بقول ان کے جد امجد کا نام بھی ہے۔ انہوں نے اپنے بزرگوں سے بھی سن رکھا تھا کہ ان کے اجداد بخارا سے آئے تھے۔

تعلیم کا اصل دور گورکھپور سے شروع ہوا، زیادہ تفصیل معلوم نہ ہوسکی۔ اتنا ضرور ہے کہ وہ اکثر پروفیسر محمود الٰہی کی شفقتوں اور عنایتوں کا تذکرہ کرتے۔ گورکھپور یونیورسٹی ہی کے ایک اور مشہور پروفیسر ڈاکٹر سلام سندیلوی، ان کے استاد تھے۔ اور بھی اساتذہ کے نام ان کی زبان پر آتے رہتے لیکن محمود الٰہی مرحوم سے خاص تعلق کا اظہار انہوں نے نذر محمود الٰہی کے نام سے ایک مجموعۂ مضامین شایع کر کے کیا، سلام سندیلوی استاد تھے لیکن ان کی منصبی ترقی کے لیے شاگرد رشید نے جو کوششیں کیں وہ خود استاد کے لیے ناقابل فراموش ہوگئیں۔ احسان شناسی کا یہ جوہر ایسا لگتا ہے کہ ان کی طبیعت میں سب سے زیادہ رکھا گیا۔ ان کی زندگی سے جن کا براہ راست تعلق نہیں وہ بھی ان کی اس خوبی کا ان کی تحریروں کے ذریعہ پتہ لگا سکتے ہیں۔

گورکھپور کے بعد وہ علی گڑھ گئے اور پھر وہیں کے ہو رہے۔ ہمیشہ یہ کلمہ زبان پر جاری رہا کہ

ع یہ خاک کہ ہے جس کا جنوں صیقل ادراک

آل احمد سرور کی شکل میں ایک اور راہ نما ہستی کے دست شفقت کا لمس سر اور شانوں کو نصیب ہوا، استاد کی زبان سے یہ الفاظ ان کے دل تک پہنچتے رہے کہ میں تمھیں بہت عزیز رکھتا ہوں اور چاہتا ہوں کہ تم جلد پی ایچ ڈی کر لو۔ احسانوں کو یاد کرنے کا جذبہ یہاں بھی ظاہر ہوا، آل احمد سرور پر ایک نہایت باوقار اور وقیع سمینار کا اہتمام کیا۔ سر سید ہال ریویو دیکھ کر شمس الرحمن فاروقی نے لکھا کہ یہ دیکھ کر اور خوشی ہوئی کہ جدید فیشن کے برخلاف سرور صاحب کی خدمات اور اہمیت کا پورا اعتراف کیا ہے۔ صدر شعبہ اردو ہوئے تو کئی یادگار سمینار ان کی قسمت میں آئے، ان میں سردار جعفری سمینار بھی شامل ہے۔ کمال یہ ہے کہ ان سمینار کی شہرت دور تک پہنچی، لیکن خود اصغر عباس مرحوم اس شہرت کی دیوار سے بہت دور کسی اور سایے ہی میں نظر آئے۔ شاید اسی لیے محبوب الرحمن فاروقی نے کہا کہ اصغر تو انسان شناس ہیں، محمود الٰہی کے بنائے ہوئے ہیں۔ علی گڑھ کی محبت نے ان کو سر سید شناسی کے لیے تیار کیا، مولانا حالی تو سر سید کی نظر میں تھے اور خود سر سید حالی کے مرکز نظر تھے۔ لیکن ایک زمانہ کے بعد اصغر عباس نے جس طرح سر سید کو تلاش کیا وہ واقعی احسان ہی نہیں انسان شناسی کی ایک مثال ہے۔ انہوں نے اپنی علمی صلاحیتوں کا مرکز صرف سر سید اور متعلقات سید کو بنالیا، سید احمد خان، سر سید، اقبال اور علی گڑھ، سر سید کی تعزیتی تحریریں، سر سید کی صحافت، سر سید کا سفر نامہ لندن، انتخاب مضامین علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ، سر سید کی سائنٹفک سوسائٹی اور شذرات سر سید، یہ سب لکھ کر انہوں نے حیات جاوید کے سامنے حیات جاوداں کا گویا نعرہ بلند کر دیا۔ خالد حسن قادری، قدر شناس نکلے تو کہا کہ سر سید کی بعض کتابوں کو دیکھنے اور باقاعدہ مطالعہ کرنے کی توفیق، اصغر عباس کی بدولت ملی، سر سید کی صحافت ، کتاب آئی تو مولانا سعید احمد اکبر آبادی نے اسے نئی وادی میں قدم رکھنے سے تعبیر کیا اور تحقیق جمع مواد اور حسن ترتیب و نگارش کا حق ادا کرنے پر داد دی، کمال یہ کہ وہ نئی نئی وادیوں کی سیر کرتے رہے لیکن اس سیر و سفر میں کوئی شور نہیں کوئی غل نہیں، شاید اسی لیے سید حامد کو یہ ادا اتنی پسند آئی کہ کہنے لگے کہ جس خاموشی سے ان کا تخلیقی و تنقیدی کام ہوتا ہے وہ تنقیدی ادب میں قابل غور اضافہ کہا جائے گا۔ یہی کیا ان کا ہر کام سر سید کے تعلق سے کسی نئی زندگی کی خبر ضرور دیتا، سر سید میموریل لکچر کے لیے انہوں نے سدھارتھ شنکر رے سے بڑا اہم خطبہ لکھوالیا۔ شمس الرحمن فاروقی کو اعزازی ڈی لٹ کی ڈگری دلانے میں ان کا جذبہ قدر شناسی کام کر گیا۔ قرۃ العین حیدر کے متعلق ان کی یہ سعی لاحاصل رہی تو لکھا کہ مجھے اب تک یہ صدمہ ہے کہ اعزازی ڈی لٹ کے لیے ان کا نام کیوں نہیں تجویز کیا۔ پھر شدت احساس میں یہ بھی لکھ دیا کہ قلب و دماغ پر پردہ پڑ جانا اسی کو کہتے ہیں۔

متعلقاتِ سرسید میں انتخاب مضامین ذکاءاللہ، رشید احمد صدیقی، آثار واقدار، عرفان سید حامد، سردار جعفری شخصیت اور فن، ارمغان آل احمد سرور، مولوی سمیع اللہ خان کا سفر نامہ مسافران لندن وغیرہ ان کی تالیفات ہیں، سید سبحان اللہ عظیم گورکھپوری کا سفر نامہ حج بھی مرتب کیا اور شاید اسی محنت کا پھل تھا کہ خود ان کو سفر حج کی سعادت بھی نصیب ہوئی۔

بہت زیادہ شہرت حاصل کرنے کے رائج الوقت حربوں سے ناواقف ہونے میں یوں زیاں کا احساس نہیں ہوتا کہ شہرت سے زیادہ محبت کی خوشبو، زندگی کو خوش گوار بناتی ہے۔ اصغر عباس مرحوم کو جس نے دیکھا یا علی گڑھ میں ان کے ساتھ چند لمحے ہی گزارے وہ ان کی محبت، شرافت اور وضعداری کا دل سے قائل ہوا۔ میزبانی میں وہ سنت ابراہیمی پر عمل پیرا تھے۔ ان کے مہمان خود کو خوش نصیب سمجھتے کہ ایسا میزبان میسر آیا۔ وہ میزبان بن کر ایسے محبوب بن جاتے جس کو دیکھتے رہنے کی آرزو جاگ اٹھتی۔

دارالمصنّفین سے ان کا رشتہ ہمیشہ مضبوط ہی رہا۔ مولانا ضیاءالدین اصلاحی مرحوم سے خاص طور پر مراسم تھے، ان کے بعد ظلی صاحب سے ایسے ہی تعلقات نے شذرات سرسید مرتب کرنے کی درخواست کی، انہوں نے واقعی نادر اور گراں مایہ شذرات سرسید کو جس طرح جمع کیا وہ ان کی تلاش و جستجو، تحقیق وتدوین کے ساتھ سرسید و شبلی کی پاک روحوں کی خوشی کا سامان بن گیا۔ سرسید کے پیدائش کے دوسو سال پورے ہونے پر یہ کتاب گویا سرسید کی شان میں دارالمصنّفین کی جانب سے ایک نادر تحفۂ اعتراف بن گئی۔ اس کتاب پر ان کا مقدمہ جس کو وہ ''شروع کی بات'' کا نام دیتے تھے، ان کی عالمانہ فکر و نظر کا بھی بہترین مظہر ہے۔ زندگی میں نمایاں کارناموں کے باوجود وہ اس طرح نمایاں نہیں ہوئے جس کے وہ واقعی مستحق تھے۔ ان کے جانے کے بعد بھی ایک بڑے نقصان کا زیادہ غم نہیں دیکھا گیا لیکن سچائی یہی ہے کہ سرسید اور مشاہیر ملت کا جب بھی ذکر ہوگا، بات اصغر عباس کے ماتم تک پہنچے گی۔ خدا رحمت کند۔

ڈاکٹر یوسف عبداللہ القرضاوی مرحوم (۱۹۲۶ء۔ ۲۰۲۲ء)

ستمبر، اکتوبر میں کاروان رفتگاں میں علامہ یوسف القرضاوی بھی شامل ہوگئے۔ ۲۷ ستمبر کو وہ رحمت حق سے جا ملے۔ عمر قریب چھیانوے سال کی پائی، ان کی وفات کا صدمہ غیر معمولی طور پر محسوس کیا گیا، پورے عالم اسلام میں کسی کے اٹھ جانے پر ایسا ماتم بس کبھی کبھی نظر آتا ہے۔

وجہ ظاہر ہے کہ علم و عمل اور تقریر و تحریر میں پورے عالم اسلام میں وہ ممتاز ترین اور بلند ترین مقام پر فائز تھے اور بھی لوگ ان خوبیوں کے حامل ہوئے ہیں اور ہو سکتے ہیں مگر دل کی درد مندی کے ساتھ اظہار حق میں جرأت و بے باکی کی خوبیوں سے انہوں نے جتنا حصہ وافر پایا، اس نے ان کی شخصیت کو محبوبیت اور قبولیت عام کی ایک مثال بنادیا۔

وہ مصر میں ۱۹۲۶ء میں پیدا ہوئے، دو سال کی عمر میں باپ کا سایہ اٹھ گیا، لیکن اللہ نے نو سال کی عمر میں حفظ قرآن کی نعمت سے نواز کر جو بنیاد عطا کی اس نے ان کی زندگی کا رخ ہمیشہ کے لیے اس منزل کی جانب کر دیا جہاں صرف اور صرف اسلام کے لیے جینے اور مرنے کی سب سے بڑی سعادت رکھ دی جاتی ہے۔

جامعہ ازہر اور دوسرے اہم تعلیمی ادارے ان کی علمی زندگی کے زینے بنتے گئے۔ پی ایچ ڈی کا مقالہ ان کے اس تعلیمی سفر کا اختتام بھی تھا اور تعلیمی زندگی کے بعد کی دنیا میں ان کے میدان عمل کے آغاز کا اعلان بھی تھا۔ ان کا مقالہ اقتصادی مشکلات کے علاج میں زکوۃ کی اہمیت اور اس کی کامیابی کے شرائط کے عنوان پر تھا۔ مشکلات کے حل کے لیے زکوۃ کے کردار نے انسانی مسائل و مصائب کے حل کرنے کے اسلامی پیغام تک ان کو پہنچادیا۔ مصر میں اسلام بیزار زبانوں نے ایسے اسلامی پیغام رسانوں کے لیے اخوانی کا لفظ ایجاد کیا اور اس کو اسلامی اخوت کے معانی و مفاہیم سے جدا کر کے کسی اور شکل میں دیکھنے کی صہیونی طریق عمل کو اپنایا، اسی حوالہ سے، نوجوان یوسف کو قید و بند کی آزمائشوں کے حوالے کر دیا گیا، یوسف القرضاوی، حفیظ و علیم کے درجہ تک پہنچے یا نہیں، اتنا ضرور ہوا کہ یوسف کی معنویت سے وہ آشنا ہو گئے۔ اس کے بعد تو زنداں کے در، کھلتے بند ہوتے رہے، جلاوطنی گویا مقدر بن گئی۔ کبھی کویت، کبھی قطر، کبھی الجزائر، زندگی پیغمبرانہ ہجرتوں کے نقوش تلاش کرتی رہی اور زبان و قلم دونوں اللہ رب العالمین کی اطاعت کے اقرار کے لیے سارے جہاں کی خوشنودی اور خفگی سے بے نیازانہ اعلان کرتے رہے کہ وبذلک امرت۔

علامہ کی علمی و عملی زندگی کا عطر اور خلاصہ، اسلامی احکام و اخلاق و عقائد کو ان کی اصل شکل میں دیکھنا اور دکھانا ہے، فقہ کا لفظ ان کے ہاں محض ایک اصطلاح نہیں، اس لفظ کو انہوں نے فلسفہ و کلام کا مقام عطا کر دیا۔ زکوۃ، حلال و حرام، جہاد، طہارت، صیام، غناء و موسیقی، اللھو والترویح جیسی بے مثال کتابوں کے ناموں میں مسلسل لفظ فقہ کی شمولیت کا ایسا اہتمام شاید ہی کسی متقدم و متاخر کے ہاں ملتا ہو، ان کی سینکڑوں کتابوں رسالوں اور مضامین میں بس یہی عقیدہ و عبادت اور معاشرت و معیشت حتی کہ تاریخ و

ادب وشعر میں بھی اسی لفظ فقہ کی حکمرانی ہے۔اس کے پس منظر میں شاید وہ احساس رہا ہو جو فقیہہ شہر کی بے توفیقی پر صدیوں سے نالاں وپریشاں رہا ہے۔

ہم نے ان کتابوں کے نام ہی پڑھے اور سنے ہیں، ان کی کئی کتابوں کے ترجمے بھی اردو میں شایع ہوئے، ان کے متعلق برصغیر کے اہم علماء نے خراج تحسین ادا کرنے میں بخل سے کام نہیں لیا اور حقیقت بھی یہی ہے کہ وہ علمائے عالم اسلام ہوں یا علمائے ہند سب کی نظروں میں وہ حجۃ العصر، آیت من آیات اللہ، محقق کبیر اور وارث رسول اسلام علیہ السلام کی طرح تھے۔ مقامات عالیہ کو طے کرنے کے بعد بھی خاکساری کا یہ عالم واقعی تقلید کے لائق ہے کہ ''ہندوستانی مسلمانوں کا ہم پر حق ہے، اس لیے بھی کہ ہم عرب مسلمانوں نے علمائے ہند کے قلمی ثمرات اور علوم اسلامیہ خصوصاً سنت نبویہ کی خدمت میں ان کی کوششوں سے بھرپور فائدہ اٹھایا ہے''۔اس وسعت قلب وذہن نے ایک عالم کو ان کا گرویدہ بنادیا، ان کی ہر تحریر یہی پیغام دیتی کہ اسلام کے بنیادی اور امتیازی اوصاف کی جانب انسانوں کو متوجہ کیا جائے، ہمارے لیے صرف اسلام کی حفاظت عزیز ہونی چاہیے۔ مشکلات کے حل کی شکل میں اندھیرے سے روشنی میں آنے کی ضرورت کے لحاظ سے اسلام کو پیش کیا جانا چاہیے۔ یہی جذبہ تھا جو ان کو دارالمصنّفین کے سمینار، اسلام اور مستشرقین میں شرکت کے لیے اعظم گڑھ لے آیا تھا۔ ۱۹۸۲ء میں دارالمصنّفین کے اس سمینار میں برصغیر، عرب، یورپ اور امریکہ تک کے اہل فکر ودانش جمع ہوئے۔ اس وقت کے دارالمصنّفین کے ناظم سید صباح الدین عبدالرحمن مرحوم نے ان تمام مہمانوں میں سب سے پہلا نام جس کا لیا وہ یہی یوسف القرضاوی تھے جن کے متعلق انہوں نے مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے ان لفظوں کو اپنے جذبات کا ترجمان بنایا کہ علامہ یوسف، فکر صحیح اور جذبہ اسلامی کے لیے امتیازی حیثیت رکھتے ہیں، وقار اور متانت کا پیکر ہیں۔

حقیقت یہی ہے کہ وقار ومتانت کے اس پیکر کی دید ہماری زندگی کی چند بڑی خوش نصیبیوں میں ایک ہے۔ جب انہوں نے سمینار کے افتتاحی اجلاس کی صدارت کی تو ہم صرف ان ہی کو دیکھتے رہ گئے۔ان کی تقریر کی لذت اور ان کے الفاظ کی یہ معنویت کہ یہاں دو رابطے جمع ہوگئے ہیں، ایک تو عقیدہ اسلام کا ہے جو سب سے زیادہ مضبوط اور مستحکم ہے، دوسرا علم کا ہے جو قوی بن کر رشتوں کو جوڑتا ہے، فصیح عربی میں انہوں نے جس طرح دارالمصنّفین بلکہ علمائے ہند کو مجمع العقیدہ والعلم قرار دیا اس کی تاثیر تھی کہ جو عربی نہیں جانتے تھے وہ بھی ان لفظوں کی موسیقیت میں گم سے ہوگئے۔

دارالمصنّفین میں وہ دو تین دن رہے، اور ساری نگاہوں کا مرکز بن کر رہے، ان کی آخری تقریر تو گویا

پورے سمینار کا حاصل تھی، کیا جوش تھا، جذبات اور الفاظ میں دل اور زبان کی ایسی ہم آہنگی شاید دارالمصنّفین کی برکت تھی۔ الفاظ دلوں سے سوال کررہے تھے۔ کہ مغرب کی سیاسی اور فکری بالادستی نے آخر انسانیت کو کیا دیا، ان لوگوں نے چاند پر کمندیں ڈالیں، وہاں سے پتھر لائے لیکن اس ارضی سیارہ میں رہ کر اپنے نفس پر تو کوئی کمند نہ ڈال سکے اور نہ رنج و غم سے دامن چھڑا سکے۔ یہ تقریر آج بھی اسی طرح زندہ ہے۔

۱۹۸۲ء کے یوسف القرضاوی ۲۰۲۲ء میں بھی اسی طرح طاغوت سے سوال کرتے رہے، جواب کا انتظار کیے بغیر صرف پیغام کو پہنچانے کی ذمہ داری کے اسوہ رسول کی اتباع میں چھیانوے سال اور قمری لحاظ سے سو سال کی عمر کا وہ واقعی حق ادا کر چلے۔ زندگی ایسی پاک، تو موت کو تو پاکیزہ تر ہونا ہی تھا۔ اس پاکیزگی کا ثبوت پورے عالم اسلام کی پلکوں میں چمکتے ستاروں سے زیادہ اور کیا ہو سکتا ہے۔ ہمارے بزرگ ہوتے تو لکھتے کہ اے یوسف القرضاوی اب آپ وہاں ہیں جہاں کسی کی دولت اور نہ کسی کا ملک ہے، آپ کے اعمال نیک کی مملکت آپ کے ساتھ ہے، دعا ہے کہ شہنشاہ علی الاطلاق اپنے خزانہ لازوال کی نعمت جاودانی سے آپ کو وہاں بھی سرفراز فرمائے۔

مولانا نظام الدین اصلاحی مرحوم (۱۹۲۷-۲۰۲۲ء)

مولانا نظام الدین اصلاحی کی وفات سے ملت اسلامیہ ہندیہ کی وہ صف اور بھی مختصر ہوگئی جو علما اور قائدین پر مشتمل تھی اور صدق احساس اور اخلاص و عمل سے اپنے وجود اور اپنے شعار سے ملک و ملت کے لیے ایک پیغام رکھتی تھی۔

مولانا اصلاحی مرحوم اعظم گڑھ کے ایک قصبہ نما گاؤں چاند پٹی میں پیدا ہوئے۔ انتقال کے وقت عمر پنچانوے سال بتائی جاتی ہے۔ اس طرح ۱۹۲۷ء سال پیدائش ہوتا ہے۔ اس بستی کی مٹی سے مولانا ابواللیث اصلاحی ندوی بھی اٹھے۔ مولانا نظام الدین اصلاحی مرحوم سے ان کی قریبی رشتہ داری بھی تھی۔ مدرسۃ الاصلاح سرائے میر سے تعلیم حاصل کی۔ مولانا اختر احسن اصلاحی جیسے نامور عالم سے خاص طور پر اکتساب فیض کیا۔ وہ دور شاید مدرسۃ الاصلاح کا سب سے سنہرا دور تھا۔ مولانا فراہی کے تلامذہ اور وہ بھی مولانا امین احسن اصلاحی جیسے عالم جلیل اور ان کے ہم عصروں کے ذریعہ علوم اسلامیہ خصوصاً تفسیر اور عربی زبان و ادب میں نئے انداز فکر اور نئے اسلوب کی شناخت ہوئی اور خود ان حضرات کی جدا اور نمایاں پہچان بنی۔ اسی جدت فکر نے مولانا مودودی اور ان کی جماعت اسلامی سے فکر

ی ہم آہنگی استوار کی۔ مولانا نظام الدین اصلاحی بھی جماعت سے وابستہ ہوئے اور اس طرح کہ زندگی کی آخری سانس بھی اسی تعلق کے ساتھ لی۔

ایک زمانہ میں مولانا جماعت اسلامی مدھیہ پردیش کے امیر تھے۔ بھوپال میں ان کا مستقل قیام تھا۔ ان کی وجہ سے وسط ہند میں جماعت کا دائرۂ اثر خاص وسیع ہوا۔ اس دائرہ میں دارالعلوم تاج المساجد کے کچھ مبتدی طالب علم بھی تھے جو آخر تک مولانا کے سایہ شفقت میں ان کی دعائیں لیتے رہے۔

مولانا کے علم و دانش کا فیض جامعۃ الفلاح سے جاری ہوا۔ مولانا وہاں کے شیخ الجامعہ بھی ہوئے۔ آخر عمر میں وہ علما کونسل کے سرپرست بھی ہوئے۔ اس طرح تعلیم و تدریس کے ساتھ ملک اور قوم کے لیے عملی جد وجہد نے ان کو کئی دوسرے ہم عصروں سے ممتاز کر دیا۔ اندرا گاندھی کے دور میں ایمرجنسی کے دن آئے تو مولانا بھی بہتوں کی طرح داخل زنداں ہوئے۔ اس وقت توضعیفی کے دن نہیں تھے مگر اب بھی قریب پنچانوے سال کی عمر میں بھی وہی جوش، وہی حوصلہ تھا اور کہا جائے کہ فعالیت کا عالم کہیں سے کم نہیں ہوا۔ ہاں یہ ضرور ہوا کہ گوشۂ عافیت نے مطالعہ کی میز کو ان سے اور قریب کر دیا۔ دارالمصنّفین آتے تو ہمیشہ بک ڈپو سے کتابیں خرید کر لے جاتے۔ کتابوں پر تبصروں کو وہ جس شوق سے دیکھتے تبصرہ کرنے والوں کے لیے وہ فخر و مسرت کی بات ہوتی۔ وہ فوراً پسندیدہ کتاب منگواتے۔ اگر جواب نہیں آتا تو پوچھتے کہ معارف میں پتہ کہیں غلط تو نہیں۔ وہ صرف مطالعہ ہی نہیں اس پر زبانی تبصرہ بھی کرتے۔ معارف کے ہر مضمون پر وہ تنقیدی نظر ڈالتے اور کبھی کبھی مشفقانہ مشورے اور نصیحتیں بھی کرتے۔

دارالمصنّفین تشریف لاتے تو کبھی کبھی اپنے پوتے کے ساتھ موٹر سائیکل پر آجاتے۔ تعجب ہوتا تھا لیکن کہیں سے پیرانہ سالی یا ضعیفی کا کوئی اثر نظر نہیں آتا۔ فون پر بھی برابر خیر خبر لیتے رہتے۔ ایک بار فرمایا کہ جماعت اسلامی کا وجود دارالمصنّفین سے ظہور میں آیا۔ عرض کیا گیا کہ حضرت اس موضوع پر مضمون یا خط کی صورت میں آپ کی تحریر دلچسپی اور غور سے پڑھی جائے گی۔ وعدہ کیا کہ ضرور لکھوں گا مگر فرصت ہستی کب بیش رہی ہے، نہیں لکھ سکے۔ یہی مضمون کیا، مولانا نے اصلاً لکھنے کی میز کو اولیت نہیں دی ورنہ قرآنیات کے علوم کی خدا جانے کتنی پرتیں ان کے صریر خامہ سے کھل جاتیں۔ مولانا بولتے بھی خوب تھے۔ آواز میں زور تھا، جملوں میں صراحت اور وضاحت لطف دے جاتی۔ مدرسۃ الاصلاح میں ان کی گل افشانی گفتار دیکھنے کے لائق ہوتی۔ اب قدیم اقدار کو جدید رنگ و روغن میں پیش کرنے والے ایسے علماء کمیاب ہوتے جاتے ہیں۔ درپیش مسائل میں ملت کے لیے یہ بھی ایک بڑا مسئلہ

ہے۔دعایہی ہے کہ اللہ تعالیٰ اس امت پر رحم فرمائے اور جانے والوں کا بہترین نعم البدل عطا فرمائے۔

آہ! احمد سعید ملیح آبادی مرحوم (۱۹۲۶ء۔۲۰۲۲ء)

اردو صحافت کی دنیا میں اپنی دنیا آپ بسانے، سجانے اور سنوارنے والے جناب احمد سعید ملیح آبادی بھی آخر رخصت ہوگئے۔ عرصہ سے صاحب فراش تھے۔ بیماری نے اس کلکتہ سے بھی جدا کر دیا جو وطن اصلی نہ ہوتے ہوئے بھی ان کے جسم و جاں سے حبل الورید سے بھی قریب تر تھا۔ وطن تو ملیح آباد تھا۔ اپنے والد جناب عبدالرزاق ملیح آبادی کے احترام میں انہوں نے بھی اس نسبت وطنی کو اپنے نام سے لگائے رکھا۔ مٹی بھی اسی ملیح آباد کی تھی اس لیے اسی کی خاک سے جا ملے۔

ملیح آباد کی بستی اصلاً ان کی ہے جن کی پہچان لفظ بانکپن سے ہے۔ یہاں ان ناموں کو گنانے کی ضرورت نہیں جو اردو ادب کے بانکے کہلائے۔ ان کا تصور سامنے رہے تو احمد سعید صاحب کی شخصیت اور پھر ان کے قلم کی رفتار اور جولانی کو سمجھنا آسان ہو جاتا ہے۔

احمد سعید کا عہد شباب دیکھا جائے تو اردو صحافت کا بھی زمانہ عروج ہے۔ دلی اور لکھنؤ میں الجمعیۃ، دعوت، قومی آواز اور بمبئی میں انقلاب، پٹنہ میں سنگم اور جنوب ہند میں رہنمائے دکن، سیاست، منصف، سالار، پاسبان وغیرہ اخبارات روزناموں کی شکل میں اردو صحافت کے رخ زیبا کا نظارہ پیش کر رہے تھے۔ ہفتہ وار اور پندرہ روزہ جریدوں کی اپنی رونق تھی۔ ایسے میں بنگال جیسے غیر اردو علاقے میں اردو کی شاہجہانی تصویر جس طرح کلکتہ کے اخبارات نے پیش کی، اس کی داستان شاید کبھی سنائی جائے لیکن احمد سعید صاحب نے مغل سلطنت کی دہلی کی طرح کلکتہ کو اردو کی مملکت کی راجدھانی بنا کر ثابت کیا کہ وہ واقعی اردو صحافت کے شاہجہاں تھے۔ وہی ذوق کی بلندی، وہی خیال کی رعنائی، نفاست اور نزاکت میں پاکیزگی فکر کی آمیزش، جدت کی راہ میں خوب سے خوب تر کی تلاش، اردو صحافت میں بغیر کسی مبالغہ کے روزنامہ آزاد ہند اور ہفتہ وار ایڈیشن اجالا پر ہاتھ رکھ کر قسم کھائی جا سکتی ہے کہ احمد سعید صاحب نے اردو صحافت کو نیا بانکپن عطا کیا۔

قومی آواز جیسے مکمل اخبار اور حیات اللہ انصاری جیسے مدبر مدیر اور قومی آواز کے نہایت باصلاحیت صحافیوں کے عملے کی موجودگی میں اگر آزاد ہند اخبار پر نظر انتخاب پہلے پڑے تو یہ معمولی بات نہیں تھی۔ بہترین مضمون اور دلچسپ مستقل کالموں، یہاں تک کہ کھیل کی خبروں میں ادبیت کا چھڑکاؤ تو تھا ہی، ملیح آبادی صاحب کے اداریوں کا انتظار بڑے بڑے اداریہ نویسوں کو کرتے دیکھا گیا۔ حاضر و موجود

مسائل ہوں یا عہد رفتہ کو آواز دینے والی آوازیں ہوں یا پھر حق و صداقت کی قدروں پر اظہار یقین ہو، ان کے اداریے فکر انگیز بن جاتے۔ اور جب یہ خالص لکھنوی زبان میں قرطاس پر الفاظ کی گل کاری میں ظاہر ہوتے تو سارا کلکتہ اور بنگال غالب کی طرح ہائے ہائے کرتا نظر آتا۔ کلکتہ اور احمد سعید صاحب کا رشتہ بیان نہیں کیا جاسکتا۔ وہ کلکتہ میں اس طرح رچ بس گئے کہ ان کے بغیر جیسے کلکتہ کا تصور ادھورا ہو۔ وہ اردو دنیا کی ہر محفل کی جان بن چکے تھے۔ کلکتہ کے علاقہ چاندنی میں ان کا دولت کدہ اردو والوں کے لیے عشرت کدہ بن گیا تھا۔ سیاسی حلقوں میں بھی ان کی بے داغ صحافت کی طرح روشن شخصیت کا احترام کم صحافیوں کے حصے میں آتا ہے۔

چند سال پہلے مغربی بنگال اردو اکیڈمی میں اردو ایڈیٹرس کانفرنس میں وہ سب کے مرکز نگاہ تھے۔ صدارت کرتے ہوئے وہ نحیف آواز میں گزرے ہوئے کارواں کے غبار میں خود اپنے نقوش تلاش کررہے تھے۔ آزاد ہند کے لیے کوئی صحیح وارث وہ پیدا نہ کرسکے۔ اس کا ملال ان کی گفتگو میں اکثر محسوس ہوتا۔ نجی گفتگو میں وہ دارالمصنفین کا ذکر ضرور کرتے اور اس بہانہ سے وہ اپنی نوعمری کی دنیا کی سیر کرتے اور کراتے بھی۔ ایک زمانہ میں وہ مدرسۃ الاصلاح کے طالب علم تھے۔ وہاں کی راہ دارالمصنفین سے ہوکر گزرتی۔ دارالمصنفین میں انہوں نے قیام بھی کیا۔ ان باتوں کا ذکر انہوں نے بڑی لذت سے اپنی کتاب "میری صحافتی زندگی" میں کیا ہے کتاب تو نظر سے نہیں گزری لیکن مدرسۃ الاصلاح اور دارالمصنفین کا ذکر مل گیا۔ بہت دلچسپ طرز بیان میں انہوں نے مدرسہ کے کھانے، کمرے، طلبہ، اساتذہ، ماحول سب بیان کردیا۔ مولانا داؤد کی شفقت و محبت کا خاص طور سے ذکر کیا۔ مولوی سعید اور مولوی اظہار ان دو مدرسین کی یاد بھی ان کو آئی۔ مولانا امین احسن اصلاحی اس وقت وہاں سے رخصت ہوچکے تھے مگر ان کے صاحبزادے سے ان کی دوستی ہوگئی۔ لکھا کہ مدرسہ کا ماحول صاف ستھرا اور پاکیزہ تھا۔ مولانا شبلی متکلم نے نظم و ضبط بھی اچھا قائم کیا تھا۔ آزادی سے پہلے جو حالات تھے ان کا اثر مدرسہ کے طلبہ پر ہونا ہی تھا۔ دو قومی نظریہ پر اساتذہ میں اور طلبہ میں بھی خوب بحث ہوتی۔ لکھتے ہیں کہ میں دو قومی نظریہ کے خلاف تھا اس لیے طلبہ کے مباحثوں میں دل کی بھڑاس خوب نکالتا۔ یہ سب یہاں اس لیے بھی دہرانا اچھا لگتا ہے کہ معلوم ہو کہ وہ کون سا ماحول تھا جس نے ملیح آبادی صاحب کے ایک عظیم صحافی ہونے کی بنیاد تیار کی، مدارس کو اس لحاظ سے کم دیکھا گیا کہ وہاں تعلیم کے ساتھ ذہن اور مزاج کی تعمیر کا کام کس طرح انجام دیا جاتا ہے۔

ان کے زمانہ کے دارالمصنفین کی تصویر بھی ان کی زبان سے بڑی دلکش ہوگئی۔ مولانا ریاست علی

ندوی چونکہ ان کے والد کے دوستوں میں تھے اس لیے مولانا نے ان کو اپنے گھر ٹھہرالیا۔ مولانا مسعود علی ندوی تھے اور مولانا سید سلیمان ندوی بھی، مولانا مجیب اللہ ندوی نماز پڑھاتے۔ فجر میں وہ دعائے قنوت پڑھتے تو بقول ملیح آبادی صاحب ان کی قرأت اتنی اثر انگیز تھی کہ ایک سماں بندھ جاتا۔ لکھا کہ اس وقت دارالمصنفین میں اہل قلم کی ایک جماعت موجود تھی۔ ان کے ساتھ رہنے کو انہوں نے اپنی خوش نصیبی سے تعبیر کیا۔ یہاں انہوں نے مولانا ریاست علی سے قرآن مجید اور مولانا مجیب اللہ ندوی سے حدیث شریف کا درس بھی لیا۔ عربی ادب کے لیے وہ مولانا عبدالسلام ندوی کی خدمت میں حاضری دیتے۔ مولانا کی خاص افتاد طبع کا بھی ذکر کیا ہے۔

ملیح آبادی صاحب نے جو لکھا اس کو وہ ان محفلوں میں اور لذت سے بیان کرتے جہاں کوئی دارالمصنفین والا موجود ہوتا۔ وارفتگی کے عالم میں کہتے کہ دارالمصنفین کا ماحول کچھ عجیب ہی علمی تھا۔ ایک سے ایک کتاب اس کی ٹکسال سے نکلتی تھی۔ کہتے تھے کہ دارالمصنفین کے مختصر سے قیام نے جیسے ان کی آئندہ اور پوری زندگی کا ایک نصب العین متعین کر دیا۔

دارالمصنفین کے قیام کے زمانہ میں وہ یہ بات بھی نہیں بھولے کہ پنڈت نہرو سے ان کا تعارف پہلی بار مولانا مسعود علی ندوی نے یہیں کرایا تھا۔ اس موقع پر پنڈت نہرو نے مولانا مسعود علی ندوی سے کہا تھا کہ میں نے اردو تم سے پڑھی اور اردو میں پہلا خط بھی تم ہی کو لکھا۔ پنڈت نہرو سے ملیح آبادی صاحب کا تعارف مولانا مسعود علی ندوی نے یہ کہہ کر کرایا کہ ہم اور تم ایک نمبر کے نیشنلسٹ ہیں۔ اب ایک صحیح ایک بٹہ دو نیشنلسٹ باپ کے بیٹے سے ملیے۔ نوجوان ملیح آبادی کے لیے یہ ملاقات اور پہچان ناقابل فراموش بن گئی۔

نیشنلسٹ تو ملیح آبادی صاحب تادم آخر رہے لیکن ان کی سچائی، بے باکی اور حق بات برملا کہنے کی خوبی اور سب سے بڑھ کر ایک صحافی کی بے نیازانہ طبیعت نے ہمیشہ ان کو احترام کے لائق بنائے رکھا۔ صحافیوں کے لیے ان کی شخصیت یقیناً ایک لائق تقلید نمونہ ہے۔ خوش روئی، خوش قامتی، خوش گفتاری اور خوش کرداری جس شخصیت کے ترکیبی عناصر بن جائیں وہ نظر کے ساتھ فکر کا مرکز بن جاتی ہیں۔ خدا ایسوں پر رحمت کی بارشیں کرے۔

ادبیات

گنبدِ خضرا کے سائے میں

علیٰ صاحبہ اُلف اُلف تحیۃ

محمد سمعان خلیفہ ندوی

بھٹکل، کرناٹک ibnulkhaliq@yahoo.com

ظہورِ اقدس وجودِ انور — درود تم پر سلام تم پر
تمھیں سے ہے تابشوں کا ہالہ — عرب میں تم سے ہوا اجالا
عجم کو ظلمت سے ہے نکالا — سفینہ انسان کا سنبھالا
تمھیں سے ہستی ہوئی منور — درود تم پر سلام تم پر
تمہیں خدا نے بہت ہے چاہا — تمہارے اخلاق کو سراہا
تمہیں ہو یاسیں تمہیں ہو طٰہٰ — ہمارے شافع تمہیں ہو شاہا
تمھیں مسیحا تمھیں ہو دل بر — درود تم پر سلام تم پر
تمہیں سے شرحِ کتاب بھی ہے — وفا کا درس ونصاب بھی ہے
تمہیں سے قائم ثواب بھی ہے — تمہیں سے دوری عذاب بھی ہے
تمہیں ہو انسانیت کے رہبر — درود تم پر سلام تم پر
ہے بندگی کا شعور تم سے — دلوں کی دنیا میں نور تم سے
ہے محفلوں کا سرور تم سے — ملی شرابِ طہور تم سے
سخن بھی تم سے ہوا معطر — درود تم پر سلام تم پر

غزل

زاہد جعفری

جعفری باغ، جلالپور، فیض آباد۔یو۔پی۲۲۴۱۴۹

موبائل:۹۴۵۲۶۵۲۴۸۸

ہوگیا جادو گری سے یا تو آئینہ غَلط — یا تو چہرے پر کسی نے رکھ دیا چہرہ غَلط

ہونے کو ہو جائے! ہوتا ہے اگر بیٹا غَلط
غیر ممکن ہے کہ ہوجائے مگر ممتا غَلط

پھول گر سچا ہے تو بانٹے گا خوشبو ہر طرف
پھول کے پہلو میں رہ کر ہوگیا کانٹا غلط

تھی مہاجن کی وہ چوکھٹ وہ نہ تھا مندر کا در
آپ ہی کی تو خطا تھی! ماتھا کیوں ٹیکا غَلط

اس سے پوچھو جس کا گھر جلتا ہو اور پانی نہ ہو
اجنبی نِردوش تھا! تھا اپنا ہمسایہ غَلط!

میں تھا سب سے چھوٹا! حصے میں ملی بس بوڑھی ماں
بھائیوں نے کر لیا تو گھر کا بٹوارہ غَلط!

اِتنی اونچی تیری ڈیوڑھی گر گئی نا؟ یک بیک
تونے تو بنیاد میں پتھر ہی خود رکھا غَلط

اس کی باتیں معتبر تھیں اِس لیے خاموش تھا
اے امیرِ شہر! تھا تیرا لب و لہجہ غَلط!

اشک کی برسات آنکھوں کا مقدر ہوگئی
دل کے کاغذ پر لکھا کیوں عشق کا اِملا غَلط؟

میرے لفظوں سے ہوئے جو ماہرِ شعر و سخن
اب مرے بارے میں کرتے ہیں وہی چرچا غَلط

لوگ میری شاعری سے اِتنا کیوں جلنے لگے
میں نے زاہد جعفری! کیا چُن لیا رستہ غَلط؟

غزل

برزمین مرزا غالب

ڈاکٹر راہی فدائی
موبائل نمبر: ۹۴۴۸۱۶۶۵۳۶

کہتی ہے ہر نگاہ کہ وہ معتبر گئی
شہرت بلندیوں پہ مگر بے بصر گئی

دستار ہی تو اب کے بچی سارے جسم میں
اپنی تمام سعی فقط زیب سر گئی

اس سے سنبھل نہ پائی وراثت اصول کی
جیسے وہ آئی ، ویسے عطائے پدر گئی

قاری جو تھے ، خبر کی صداقت میں کھو گئے
بین السطور بس ، نظر دیدہ ور گئی

صدیوں مہہ و نجوم کے خوابوں میں ہم رہے
پھر ہاتھ سے یہ مملکتِ بحر و بر گئی

دوشِ ہوا پہ رہ کے بھی روشن رہا چراغ
گل ہو نہ پائے ، ساتھ دعائے سحر گئی

موجودہ ضابطوں میں وہ شاید تھی بے محل
معیارِ حق تھی بات ، مگر بے اثر گئی

دستِ خلوص ، فن کے تقاضوں میں کامیاب
شوقِ مقابلہ میں ہوس بے ہنر گئی

اک لمس جس نے قلب و نظر زندہ کر دیے
اک پھونک تھی جو روح کو تابندہ کر گئی

سچ کے قریب اسے نہ کہیں آسرا ملا
راہی پتہ نہیں وہ شرافت کدھر گئی

معارف کی ڈاک

شاہ منیر عالم غازی پوری اور علی گڑھ

معارف (اگست ۲۰۲۲ء) میں ناچیز کے مضمون (شاہ منیر عالم غازی پوری اور علامہ شبلی) پر اپنے تاثرات میں بعض قارئین کرام نے شاہ صاحب سے متعلق کچھ مزید معلومات بہم پہنچائی ہیں۔ میں اس کے لیے ان حضرات کا ممنون ہوں۔ شاہ ظفر الیقین صاحب نے اپنے مراسلے میں سر شاہ سلیمان سابق وائس چانسلر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے شاہ منیر عالم صاحب کی قرابت کا ذکر کیا ہے۔ بعض دیگر قارئین کے توسط سے شاہ صاحب اور ان کے خانوادے کے علی گڑھ سے روابط سے متعلق کچھ اور مفید معلومات ملی ہیں۔ ناچیز کے مضمون کو پڑھ کر خدا بخش لائبریری، پٹنہ کی ڈائرکٹر محترمہ شائستہ بیدار صاحبہ نے براہ راست مجھے اپنے تاثرات بھیجے ہیں۔ انہوں نے خاص طور سے ادارۂ سرسید سے شاہ منیر عالم صاحب کے تعلق اور ان کے خانوادے کے بعض افراد کے اس ادارہ سے بحیثیت استاد طویل وابستگی کے بارے میں مجھے ایسی اطلاعات فراہم کی ہیں جو میرے لیے بالکل نئی ہیں اور (ایک طویل عرصہ سے علی گڑھ میں رہتے ہوئے بھی) میں ان سے بے خبر تھا۔

ناچیز نے اپنے مضمون میں شاہ صاحب کے قدیم کتب (بالخصوص مخطوطات) جمع کرنے کے شوق کا ذکر کیا تھا اور اس سلسلہ میں مولانا سید سلیمان ندویؒ کے مشاہدات و بیانات کا حوالہ بھی دیا تھا۔ ڈاکٹر صاحبہ کی اس قیمتی اطلاع (کہ مولانا آزاد لائبریری، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں شاہ منیر عالم کے نامِ نامی سے منسوب ایک ذخیرہ کتب "منیر عالم گلکشن" ہے، جس میں زیادہ تر مخطوطات ہیں) نے ان کے اس شوق کا مزید ثبوت فراہم کر دیا۔ مذکورہ لائبریری کے شعبۂ مخطوطات میں، میں نے خود جا کر "منیر عالم گلکشن" کی فہرست دیکھی تو یہ معلوم ہوا کہ اس ذخیرے میں عربی، فارسی و اردو کی ۱۹۱ کتب ہیں جن میں دو کے علاوہ باقی (۱۸۹) قلمی کتب، مخطوطات ہیں۔ یہ گلکشن ۲۴، عربی، ۱۵۸، فارسی اور ۹، اردو کتب پر مشتمل ہے۔ قرآن کریم کے متعدد قدیم نسخوں اور حدیث و سیرت کی کچھ کتابوں کے علاوہ اس ذخیرے کے تحت فقہ، تصوف، طب، علمِ موسیقی، تاریخ، تذکرہ و قدیم مذاہب سے متعلق کتب اور ملفوظات، رقعات و مکتوبات کے مجموعے، قدیم فارسی شعراء کے دواوین اور فارسی لغات و فرہنگ دستیاب ہیں۔ اس قیمتی ذخیرے کے متعدد فارسی مخطوطات عہدِ وسطیٰ کے ہندوستان سے تعلق رکھتے ہیں۔ شاہ منیر عالم صاحب کی اپنی تحریر اور فہرست میں دی گئی توضیحات کے مطابق اس ذخیرے کے

قدیم و نادر مخطوطات میں قرآن مجید کے بخط غبار ایک نسخہ کے علاوہ چہل حدیث مع فارسی ترجمہ، تاریخ برمکی (عربی سے فارسی میں ترجمہ از ضیاءالدین برنی)، دیوان حافظ (از قلم ابوالفیض فیضی)، مثنوی مولانا روم، شاہنامہ فردوسی، دیوان ملّا سعید مازندانی (استاد زیب النساء)، کلیاتِ حزین (از قلمِ زینت النساء)، دیوان ظہیرالدین فاریابی اور فرحت الناظرین کے نسخے شامل ہیں۔ ابھی قطعی طور پر یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ ذخیرۂ منیر عالم کس سن میں مولانا آزاد لائبریری میں منتقل ہوا۔ البتّہ یہ یقینی ہے کہ ۱۹۵۰ء سے قبل یہ ذخیرہ اس لائبریری میں محفوظ ہو چکا تھا، اس لیے کہ اس کے رجسٹر میں فہرست پر پہلی بار اسٹاک چیکنگ کے بعد اسسٹنٹ لائبریرین، شعبۂ مخطوطات محمد عبدالشاہد خاں (م: ۱۸؍ فروری ۱۹۸۴ء) کی دستخط کے نیچے تاریخ ۳۱؍ جولائی ۱۹۵۰ء مندرج ہے۔ اس ذخیرۂ کتب سے متعلق ایک قابل ذکر بات یہ ہے کہ اس عطیہ کے ساتھ شاہ منیر عالم صاحب کی مرتبہ مطبوعہ فہرست بھی عنایت کی گئی تھی۔ یہ فہرست مولانا آزاد لائبریری کو ذخیرۂ کتب کی منتقلی سے بہت پہلے تیار کی گئی تھی۔ اس میں صرف ۱۲۳ کتب کا اندراج ہے، جب کہ اس ذخیرے کے مولانا آزاد لائبریری منتقل ہونے کے بعد اس کی تیار کردہ فہرست میں ۱۹۱ کتب کا اندراج ملتا ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مطبوعہ فہرست تیار ہونے کے بعد عطیہ کردہ ذخیرہ میں کافی اضافہ کیا گیا۔ شاہ صاحب کی مرتبہ فہرست یونائٹڈ انڈیا پریس لکھنؤ سے طبع ہوئی تھی۔ اس پر سنِ طباعت درج نہیں ہے۔ لیکن اس کے شروع میں ''گذارشِ حال'' کے عنوان سے ابتدائی کلمات میں شاہ منیر عالم صاحب کے بعض بیان سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ فہرست ۱۹۳۰ء یا اس کے آس پاس کی تیار کردہ ہے۔ اس میں ایک جگہ انہوں نے یہ تحریر کیا ہے کہ ''دسمبر ۱۹۲۹ میں ایسا علیل ہوا جس [کی وجہ] سے قبل از وقت پنشن لینی پڑی اور تاحال معذور و مجبور ہوں اور زیادہ مطالعہ کی ممانعت ہے''۔ مطبوعہ فہرست میں ایک جگہ شاہ صاحب کے نام کے ساتھ ''جنیدی'' کی نسبت ملتی ہے۔ یہ اصلاً ان کے مورثِ اعلیٰ ''شاہ جنیدؒ'' کی طرف نسبت ہے جو ان کے اہلِ خاندان میں سب سے پہلے غازی پور میں سکونت پذیر ہوئے تھے، جیسا کہ ناچیز کے مضمون میں اس کا ذکر آچکا ہے۔ مزید یہ کہ ''گذارشِ حال'' کے آخری حصے میں شاہ صاحب کا یہ اہم بیان بھی ملتا ہے: ''خیال تھا، بلکہ قصدِ مصمم تھا کہ خدائے تعالیٰ کو منظور ہوا تو اِن جملہ جواہر پاروں کو ایک بار بغور مطالعہ کرنے کے بعد دار العلوم علی گڑھ کی نذر کردوں گا، مگر اب تک نہ تو صحت ایسی ہے کہ مطالعہ کر سکوں یا وقف کر سکوں''۔ اس مطبوعہ فہرست سے علی گڑھ کی نسبت سے ایک اور قیمتی بات یہ معلوم ہوئی کہ شاہ منیر عالم صاحب ایم۔ اے۔ او کالج کے ٹرسٹی رہے ہیں۔ اس فہرست کے ٹائٹل کور پر یہ مذکور ہے :

بسم اللہ الرحمن الرحیم
نحمدہ و نصلّی علی رسولہ الکریم
فہرستِ کتب قلمی نادرہ وچیدہ
من مملوکات جناب شاہ منیر عالم صاحب بی۔اے،ایل ایل بی، رئیس و پنشنر
سب جج درجۂ اول و اسسٹنٹ سشن جج و سابق ٹرسٹی ایم۔اے۔او کالج علیگڑھ و سابق ممبر ایشیاٹک سوسایٹی بنگال وغیرہ وغیرہ۔میان پورہ غازی پور (یو۔پی)

ڈائرکٹر خدابخش لائبریری کے خط میں یہ بھی مذکور تھا کہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے سابق استاد پروفیسر شاہ مشہود عالم صاحب (م:۱۱؍مئی ۲۰۰۲ء) شاہ منیر عالم مرحوم کے خانوادے سے تعلق رکھتے تھے۔ شعبۂ زولوجی کے ممتاز پروفیسر شاہ مشہود عالم صاحب سے تو میں بہت پہلے سے واقف تھا، لیکن یہ نہیں جانتا تھا کہ ان کا تعلق غازی پور کے ایک ایسے ممتاز خاندان سے ہے جس سے علامہ شبلیؒ اور ان کے تلمیذ رشید مولانا سید سلیمان ندویؒ کے گہرے روابط رہے ہیں۔ پروفیسر مشہود عالم مرحوم نے تقریباً ۳۸ برس شعبۂ زولوجی میں تدریس کی خدمت انجام دی اور وہ ۱۶ برس (۱۹۶۶۔۱۹۸۱ء) صدرِ شعبہ کے منصب پر فائز رہے۔ ڈاکٹر صاحبہ کے مکتوب گرامی سے یہ بھی معلوم ہوا کہ کشمیر یونیورسٹی کے سابق وائس چانسلر شاہ منظور عالم صاحب (م:۲۲؍جون ۲۰۲۱ء) پروفیسر شاہ مشہود عالم صاحب کے برادرِ خورد تھے۔

پروفیسر منظور عالم صاحب ماہرِ علم جغرافیہ تھے اور ۱۹۸۴ء تا ۱۹۸۷ء کشمیر یونیورسٹی کے وائس چانسلر کے منصب پر فائز رہے۔ اس سے قبل انہوں نے ایک طویل عرصے تک شعبۂ جغرافیہ، عثمانیہ یونیورسٹی میں بہ حیثیت پروفیسر تدریسی و تحقیقی خدمت انجام دی تھی۔ ان سب کے علاوہ جب یہ اطلاع ملی کہ پروفیسر مشہود عالم مرحوم کے صاحبزادے پروفیسر شاہ شہود عالم صاحب علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے انجینئرنگ کالج کے شعبۂ میکینکل انجینئرنگ سے وابستہ ہیں تو میں نے فون پر ان سے رابطہ کیا اور جامعہ اردو روڈ پر ان کے مسکن ''مشہود کدہ'' پر ان سے ملاقات کی اور ان کے خاندان کے بارے میں کچھ مزید معلومات حاصل کی۔ اللہ تعالیٰ ہمیں قدیم علمی ورثہ کے تحفظ اور علم کی اشاعت کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین ثمّ آمین۔

(پروفیسر) ظفرالاسلام اصلاحی، علی گڑھ
zafarul.islam@gmail.com

رسید کتب موصولہ

اثراتِ شبلی (جلد اول و دوم) : ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی، دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ صفحات بالترتیب ۲۷۲و۲۷۲۔ سالِ اشاعت ۲۰۲۲ء، قیمت بالترتیب: ۴۰۰روپے، ۴۰۰روپے۔

اسبابِ نجات : (شیخ شرف الدین احمد یحیٰ منیریؒ) جامع قاضی اشرف ابن رکن بلخی، خانقاہ، منعمیہ میتن گھاٹ، پٹنہ سیٹی، بہار صفحات ۲۴۸۔ سال اشاعت ۲۰۲۱ء، قیمت ۲۰۰روپے۔

القول السّدید فیما یتعلق بہ تکبیر ات العیدین : مولانا محمد عبدالرحمن مبارکپوری، تخریج: مولانا راشد حسن مبارکپوری۔ ص۔ب ۶۷۵۹/ ۱۴، بیروت، صفحات ۲۱۰، سال اشاعت ۲۰۲۱ء، قیمت درج نہیں۔

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اور میری داستانِ حیات : الما لطیف شمسی (علیگ)، بک امپوریم سبزی باغ، پٹنہ، صفحات ۲۲۷، سال اشاعت ۲۰۲۲ء قیمت ۲۰۰روپے۔

گلِ نسرین : نفیس سیتاپوری، دانش محل ، امین آباد لکھنؤ۔ صفحات ۱۸۰۔ سال اشاعت ۲۰۲۱ء، قیمت ۱۵۰روپے۔

گنج لایفنی (شیخ شرف الدین احمد یحیٰ منیریؒ) جامع: زین بدر عربی، خانقاہِ منعمیہ، میتن گھاٹ، پٹنہ سیٹی، بہار۔ صفحات ۴۴۸۔ سال اشاعت ۲۰۲۲ء، قیمت ۴۰۰روپے۔

محمد بن عبدالوہاب ایک مظلوم اور بدنام مصلح : مولانا مسعود عالم ندوی، تدوین محمد جابر زماں، مکتبہ الفہیم مئوناتھ بھنجن۔ یوپی، صفحات ۵۲۰۔ سال اشاعت ۲۰۲۰ء، قیمت ۴۰۰روپے۔

مولانا محمد الیاس اور ان کی تبلیغی تحریک : مولانا محمد عبدالملک جامعی مدنی، مرتب: معصوم مرادآبادی، ایجوکیشنل بک ہاؤس، شمشاد مارکیٹ علی گڑھ۔ صفحات ۲۰۰۔ سال اشاعت ۲۰۲۲ء ، قیمت : ۲۰۰ روپے۔

ندرتِ عشق (علامہ باقر آگاہ ویلوری کی مثنوی) : ڈاکٹر راہی فدائی، الانصار پبلی کیشنز، ریاست نگر حیدرآباد۔ صفحات ۲۲۴۔ سال اشاعت ۲۰۱۹ء، قیمت ۲۵۰روپے۔

نقد و نظر : ڈاکٹر سید علیم اللہ حسینی ، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس ، دہلی۔ صفحات ۱۶۸۔ سال اشاعت ۲۰۲۲ء، قیمت: ۱۱۱روپے۔

تصانیف علامہ شبلی نعمانیؒ

کتاب	قیمت
سیرۃ النبیؐ جلد اول و دوم (یادگار ایڈیشن)	2000/-
سیرۃ النبیؐ (خاص ایڈیشن مکمل سیٹ ۷ جلدیں)	2800/-
مقدمہ سیرۃ النبیؐ	30/-
الفاروق	350/-
الغزالی	300/-
المامون	175/-
سیرۃ النعمان	300/-
سوانح مولانا روم	220/-
شعر العجم (اول)	250/-
شعر العجم (دوم)	150/-
شعر العجم (سوم)	125/-
شعر العجم (چہارم)	200/-
شعر العجم (پنجم)	150/-
مکاتیب شبلی (اول)	150/-
مکاتیب شبلی (دوم)	190/-
الانتقاد علی تاریخ التمدن الاسلامی (محقق ایڈیشن) تحقیق: ڈاکٹر محمد اجمل ایوب اصلاحی	350/-
خطبات شبلی	150/-

کتاب	قیمت
موازنہ انیس و دبیر	250/-
اورنگ زیب عالمگیر پر ایک نظر	100/-
سفر نامہ روم و مصر و شام	200/-
کلیات شبلی (اردو)	220/-
کلیات فارسی (فارسی)	--
مقالات شبلی اول (مذہبی)	170/-
مقالات شبلی دوم (ادبی)	70/-
مقالات شبلی سوم (تعلیمی)	170/-
مقالات شبلی چہارم (تنقیدی)	200/-
مقالات شبلی پنجم (سوانحی)	150/-
مقالات شبلی ششم (تاریخی)	150/-
مقالات شبلی ہفتم (فلسفیانہ)	100/-
مقالات شبلی ہشتم (قومی واخباری)	150/-
الندوہ (۹ جلدیں)	4735/-
اسلام اور مستشرقین (چہارم)	250/-
الکلام	250/-
علم الکلام	200/-
انتخابات شبلی (سید سلیمان ندوی)	200/-

ISSN 0974-7346 Ma'arif (Urdu) Print NOV 2022 Vol. 209/11

RNI No. 13667/57 MA'ARIF AZM/NP-43/022

Monthly Journal of

DARUL MUSANNEFIN SHIBLI ACADEMY

P.O. Box No: 19, Shibli Road, Azamgarh, 276001 U.P., India

Tel. 06386324437 Email: info@shibliacademy.org

دارالمصنّفین کی چند اہم مطبوعات

سیرت عمر بن عبدالعزیز	مولانا عبدالسلام ندویؒ	100/-
مولانا الطاف حسین حالی کی یاد میں	پروفیسر اشتیاق احمد ظلی	250/-
مطالعات شبلی	""""	550/-
حیات سعدی	خواجہ الطاف حسین حالی	400/-
شبلی شناسی کے اولین نقوش	پروفیسر ظفر احمد صدیقی	600/-
شبلی کی آپ بیتی	مرتبہ: ڈاکٹر خالد ندیم	325/-
امام رازی	مولانا عبدالسلام ندویؒ	320/-
حیات سلیمان	شاہ معین الدین احمد ندویؒ	600/-
تذکرۃ المحدثین (اول)	مولانا ضیاء الدین اصلاحیؒ	200/-
تذکرۃ المحدثین (دوم)	""""	225/-
تذکرۃ المحدثین (سوم)	""""	300/-
محمد علی کی یاد میں	سید صباح الدین عبدالرحمنؒ	120/-
مولانا ابوالکلام آزاد	مولانا ضیاء الدین اصلاحیؒ	240/-
ابن رشد	محمد یونس فرنگی محلیؒ	330/-
تاریخ اسلام (اول و دوم مجلد)	شاہ معین الدین احمد ندویؒ	375/-
تاریخ اسلام (سوم و چہارم مجلد)	""""	500/-
تاریخ صقلیہ اول	سید ریاست علی ندویؒ	400/-
تاریخ صقلیہ دوم	""""	400/-
اسلام میں مذہبی رواداری	سید صباح الدین عبدالرحمن	250/-
یہود اور قرآن	مولانا ضیاء الدین اصلاحیؒ	150/-
تاریخ ارض القرآن	مولانا سید سلیمان ندویؒ	375/-